Regd. L. No.7243 Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1983

اس پرچہ میں

ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے۔

ستمبر کے پرچہ میں

قرآنی آئین کے بنیادی اصول

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

★ CLASSIC ★
(Chowk Regal)
12- The Mall Lahore
Phone: 61830

بدل اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ ″	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۶	اگست ۱۹۸۳ء	شمارہ ۸

فہرست

۱۔ لمعات (مذہب کی پیدا کردہ خود فریبیاں) ۲

۲۔ قرآنی درس کے اعلانات ۱۶

۳۔ "ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے!" محترم پرویز صاحب ۱۷
(بتقریب جشنِ نزولِ قرآن)

۴۔ نگاہِ بازگشت (رہگذرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل)۔ مرتبہ محترم محمد اسلام صاحب ۳۷

۵۔ وقت کی پکار! ۵۷

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید، مقامِ اشاعت: ۲۵-بی، گلبرگ ۲-لاہور۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس 4 - ایبک روڈ-لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

۱۴ اگست کو عام طور پر یومِ آزادی کہا جاتا ہے، لیکن وہ درحقیقت یومِ آزادی نہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمیں آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آزادی حاصل کرنے کا موقعہ میسر آیا تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں، اس سے بہت پہلے سے تحریکِ آزادی چلی آرہی تھی، لیکن (عام قوموں کی طرح) ان کا آزادی کا تصور (ہم سے) مختلف تھا۔ اُن کے نزدیک کسی غیر قوم کی محکومیت سے نجات حاصل کر لینا، آزادی کہلاتا تھا۔ اس لئے جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ دیا تو ہندوؤں کو آزادی حاصل ہو گئی۔ لیکن مسلمانوں (یا یوں کہئے کہ اسلام) کے نزدیک آزادی کا تصور اس سے مختلف تھا۔ اس کے نزدیک، انسانوں کی حکومت، خواہ وہ اپنی قوم کے افراد ہوں اور خواہ کسی غیر قوم کے، غلامی اور محکومی ہے۔ آزادی وہ ہے جس میں کسی انسان کی حکومت نہ ہو۔ حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو۔ صدرِ اوّل میں جب حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی تو مسلمانوں کو آزادی حاصل تھی۔ اس کے بعد جب اس کی جگہ انسانوں کی حکومت نے لے لی تو مسلمانوں کی آزادی ختم ہو گئی۔ اس چودہ سو سال میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، لیکن قرآن کے معیار کے مطابق، نہ وہ حکومتیں آزاد تھیں، نہ اُن میں بسنے والے مسلمان آزاد۔ آج بھی دنیا میں چالیس سے زیادہ ممالک میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں، لیکن وہ سیکولر (غیر اسلامی) معیار کے مطابق آزاد ہیں۔ اسلامی معیار کے مطابق ان میں سے ایک بھی آزاد نہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی میں بھی کتاب اللہ کی حکمرانی نہیں۔ ان کا آزاد ہونا تو ایک طرف، قرآن کے نزدیک خود ان کا اسلام بھی محلِ نظر ہے۔ کفر اور اسلام کے متعلق قرآن کا معیار یہ ہے کہ

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (۵/۴۴)

جو کوئی کتاب اللہ کے مطابق حکم نہیں کرتا۔ تو وہی لوگ کافر ہیں۔

مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (کتاب اللہ) کے مطابق حکومت قائم کرنا تو ایک طرف، آپ ذرا اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ ہمارے ہاں احیاءِ اسلام کا اس قدر چرچا (بلکہ شور) ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ـــــ اسلامی نظام۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی شریعت، کی آوازیں چاروں طرف گونجتی ہیں۔ لیکن آپ نے اس تمام ولولہ و طنطنہ، جوش و خروش میں، مندرجہ بالا آیت کو نہ کسی مسجد میں منقوش دیکھا ہوگا، نہ دار العلوم میں نہ ایوانِ حکومت میں، نہ مجلسِ قانون ساز میں۔ نہ تقریر یا تحریر میں نہ مجلسِ شوریٰ

تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ کسی خطیب کے خطبہ میں سنتا ہوگا ۔ نہ کسی واعظ کے وعظ میں ۔ پورے قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے اس آیت کو پڑھتے ہوئے یوں آگے بڑھ جاتے ہیں جس طرح ایکسپریس گاڑی چھوٹے سٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی سیدھی آگے نکل جاتی ہے ۔ ہم دستورِ پاکستان میں یہ لکھ کر، کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا، مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ ہم معیارِ خداوندی پر پورے اتر گئے ہیں ۔ لیکن ہم نے کسی قانون، کسی ضابطہ، کسی مسلک و مشرب، کسی عدالت کے فیصلہ (جس میں شرعی عدالت بھی شامل ہے) کو اس معیار پر پرکھا ہی نہیں کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق ہے یا نہیں ۔ اس کے برعکس، اسلام کے نام پر جس قدر قوانین نافذ کئے گئے، ان میں بیشتر اس معیار پر پورے نہیں اترتے ۔ لیکن، اس کے باوجود وہ سب اسلامی تصور کئے جاتے ہیں ۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ۱۴ اگست ۴۷ء کو ہمیں آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی ۔ ہمیں آزادی حاصل کرنے کا ایک موقعہ میسر آیا تھا یعنی ہم نے ایک خطۂ زمین حاصل کیا تھا اس مقصد کے لئے کہ اس میں ہم قرآن کے مطابق حکومت قائم کر سکیں ۔ ہم نے آزاد اس دن ہونا تھا جب یہاں قرآن کے مطابق حکومت قائم ہو جاتی، اور وہ آج تک قائم نہیں ہوئی ۔ اس لئے ہم ۱۴ اگست کو (قرآنی معیار کے مطابق) یومِ آزادی کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ۱۴ اگست ۴۷ء کو ہم نے ایک قطعۂ اراضی حاصل کیا تھا کہ اس پر مسجد تعمیر کی جائے ۔ جب تک اس پر مسجد تعمیر نہیں ہوگی، یہ کس طرح کہا جا سکے گا کہ ہم نے جس مقصد کے لئے وہ قطعۂ اراضی حاصل کیا تھا، وہ پورا ہو گیا ہے؟ ہم نے اس مملکت کا نام "جمہوریہ اسلامیہ" اس طرح رکھ لیا ہے جس طرح ہم اپنے بچوں کا نام عبدالرحمٰن اور محی الدین رکھ لیتے ہیں، حالانکہ نہ وہ درحقیقت رحمٰن کے عبد ہوتے ہیں نہ دین کے محی (زندہ کرنے والے) اس قسم کے نام رکھنے والی مملکتوں کے متعلق وہی کہا جائے گا جو قرآن نے کہا ہے کہ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (۵۳/۲۳) ۔ "یہ چند نام ہیں جو تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں" مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (۱۲/۴۰) ۔ "خدا نے ان کے متعلق کوئی سند نازل نہیں کی" وہ ان کے اسلامی ہونے کا سارٹیفکیٹ کیسے دے دیتا جب کہ اس کے لئے شرط یہ تھی کہ ۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اس میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہو ۔

ہندو اور انگریز کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی بنیاد سیاسی تھی ۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ شدید مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی، اور اس کی بنیاد مذہبی تھی ۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی ۔ انہیں اعتقادات ۔ عبادات (نماز ۔ روزہ ۔ حج ۔ زکوٰۃ وغیرہ) کی آزادی ہوگی ۔ ان کے پرسنل لاز (شخصی قوانین) میں کوئی مخل نہیں ہوگا ۔ اس سے زیادہ چاہئے کیا؟ انہیں سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام مذہب نہیں ۔ دین ہے ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو ہو، انہیں دین کی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی ۔ دین کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ ان کی زندگی کے ہر گوشے پر خدا کی کتاب کی حکمرانی ہو ۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ ۔۔۔۔

کس در ایں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں مساواتِ انسانیہ عملاً رائج ہوگی۔ اس میں دولت کی بنا پر طبقاتی تفریق نہیں ہوگی۔ اس میں یہ نہیں ہوگا کہ ایک شخص تاروں کے خزانے کا مالک ہو اور دوسرا روٹی تک کا محتاج۔ اس میں تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی۔ اس میں عملاً احترامِ آدمیت اور تکریمِ انسانیت کا دور دورہ ہوگا۔ ہر شخص محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہوگا۔ اس میں کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی حکومت نہیں ہوگی۔ حکومت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ اس میں قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے انسانی فکر کی آزادی ہوگی۔ انسان اور مسلمان ہونے کی جہت سے جو پوزیشن مرد کی ہوگی وہی عورت کی ہوگی۔ اس میں مملکت کی قوت اس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے ہوگی۔ افرادِ معاشرہ کی آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں ہوگی۔

یہ تھا وہ اسلام جس کے احیاء کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔

خطۂ زمین حاصل ہوا تو وہ مذہبی پیشوا جنہوں نے آخری وقت تک اس کی مخالفت کی تھی، یورش کر کے اِدھر آگئے۔ دین و مذہب کا فرق قائدِ اعظمؒ کو معلوم تھا لیکن وہ اُس وقت آفتاب لبِ بام تھے۔ ان علماء کو معلوم تھا کہ پاکستان میں اُن کے لئے اسلام (یعنی مذہب) کے نام پر اقتدار حاصل کرنے کے کافی مواقع ہوں گے۔ چنانچہ وہ آئے اور یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس لئے اس کا اقتدار ہمارے حوالے کرو کیونکہ اسلام کا علم ہمیں ہی حاصل ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی چار دن کی زندگی کے بعد یہاں جو حکومتیں بھی قائم ہوئیں، انہیں دین کا علم تو حاصل نہیں تھا، لیکن وہ اسے خوب جانتے تھے کہ زمامِ اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آجائے تو ملک کا حشر کیا ہوا کرتا ہے! اس لئے وہ آسانی سے اُن کا مطالبہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُنہوں نے ان (علماء) سے کہا کہ آپ میں اس قدر باہمی اختلافات ہیں۔ اس لئے یہاں کونسا اسلام نافذ کیا جائے گا؟ آپ پہلے اپنے اختلافات مٹا کر متفقہ مطالبہ پیش کیجئے۔ اس پر اُنہوں نے ۱۹۵۱ء میں (۳۱ علماء پر مشتمل کانفرنس میں) یہ "متفق علیہ" مطالبہ پیش کیا کہ مملکت کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ محض اتمامِ حجت کے لئے تھا ورنہ وہ جانتے تھے کہ کتاب (قرآن) کا نام محض تبرکاً لے لیا گیا ہے۔ اصل بنیاد سنت ہے اور سنت ہر فرقہ کی الگ الگ ہے جس میں وہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ سنت کا کوئی متفق علیہ مجموعہ تو ایک طرف، سنت کہتے کسے ہیں اس کا بھی کوئی متفق علیہ جواب ان کے ہاں نہیں تھا۔ چنانچہ یہ حضرات حدیث و سنت کی بحثوں میں اُلجھے رہے۔ اور حکومتیں سیکولر متشکل ہوتی رہیں۔ بالآخر بیس برس کی بحث و نزاع کے بعد مودودی (مرحوم) کو یہ کہنا پڑا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ پوچھا گیا کہ پھر یہاں اسلامی ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہوگا، تو جواب ملا کہ چونکہ ملک میں اکثریت فقہ حنفی کے پیروؤں کی ہے، اس لئے یہاں اس فقہ کو ملکی قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے حالانکہ وہ اس سے پہلے فقہ کے متعلق خود کہہ چکے تھے کہ اس نے اسلام کو "منجمد شاستر" بنا رکھا ہے۔ اسلئے

وہ جانتے تھے کہ فقہ کے احکام موجودہ زمانے کے تقاضے پورے نہیں کر سکیں گے، لہٰذا ممکن العمل نہیں ہونگے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فقہ حنفی تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ شیعہ حضرات کو تو چھوڑ دیجئے کہ ان کی احادیث اور فقہ، باقی مسلمانوں سے الگ اور مختلف ہیں۔ سُنّی مسلمانوں کو بھی اس کے اکثر احکام سے اختلاف ہے۔ (مثلاً) زکوٰۃ و عُشر سے متعلق ضوابط ہنوز زیرِ غور تھے کہ جماعت اہل حدیث نے اعلان کر دیا کہ

> مرکزی جمعیت اہل حدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو تقریباً ایک کروڑ اہلحدیث افراد اہل تشیع کی طرح بنکوں سے رقوم نکلوانے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے استفسار کیا کہ آیا صدر مملکت اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ عُشر و زکوٰۃ کی شرائط نصاب اور مصارف کے سلسلہ میں جسطرح اہل تشیع کو اہل سنت سے اختلاف ہے اسی طرح زکوٰۃ و عُشر کے بیسیوں مسائل میں اہلحدیث کو فقہ حنفی سے اختلاف ہے۔ صدر نے مرکزی و صوبائی زکوٰۃ و عُشر کونسلوں کا جو اعلان کیا ہے اس میں عدالت ہائے عالیہ کے ججوں کے تحت قانونی اور فنی ماہرین کے ساتھ شیعہ بریلوی اور دیوبندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے لیکن جماعت اہلحدیث کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ان کونسلوں میں مسلکِ اہلحدیث کی نمائندگی کوئی نہیں کریگا انہوں نے کہا حنفی علماء چاہے بریلوی ہوں یا دیوبندی فقہ حنفی سے ہی رہنمائی حاصل کریں گے اور شیعہ ارکان فقہ جعفریہ سے، لیکن اہلحدیث نہ فقہ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں اور نہ فقہ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف قرآن اور حدیث واجب التعمیل ہیں۔ ان حالات میں کونسلوں کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے اہلحدیث کے نزدیک نہ تو کسی اہمیت کے حامل ہوں گے اور نہ کسی اعتماد کے قابل۔

(روزنامہ مساوات۔ مورخہ ۲۱ جون ۱۹۷۹ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۷۹ء صفحہ ۴۴)

بہرحال مودودی (مرحوم) نے سب کچھ جانتے ہوئے یہ تجویز کر دیا کہ فقہ حنفی کو ملک کا قانون قرار دیدیا جائے۔ کسی فقہ کو ملک کا قانون قرار دے دینے کا پہلا اور بنیادی مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام کو مذہب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے، دین کی حیثیت سے نہیں۔ جن علماء نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی، ان میں سے کثیر التعداد فقہ حنفی کے پیرو تھے، اس لئے انہوں نے اس تجویز کا بہ مسرت استقبال کیا۔

ہماری تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ مذہب کے نام سے جو تحریک بھی اُٹھی اُس سے قرآن ایک قدم اور پیچھے چلا گیا۔ عباسیوں کے دور میں تدوینِ حدیث کی تحریک نمایاں ہوئی تو عقیدہ یہ وضع ہوا کہ وحی ساری کی ساری قرآن میں نہیں۔ قرآن میں صرف ایک قسم کی وحی ہے (یعنی وحیٔ جلی) اور دوسری قسم کی وحی (وحیٔ خفی) احادیث میں ہے۔ چنانچہ انہیں مثلہٗ معہٗ (قرآن کی مثل۔ قرآن کے ساتھ) قرار دیا، اور اس کے بعد کہا کہ اگر کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں اختلاف یا تضاد ہو تو حکم حدیث کا تسلیم کیا جائے گا اور قرآن کا حکم منسوخ مانا جائے گا۔ اس طرح

حدیث نے قرآن کی جگہ لے لی۔

فقہ آئی تو اس نے کہا کہ قرآن اور حدیث دونوں اس کے اندر آ گئے ہیں۔ اس لئے یہ ان دونوں پر حاکم اور قاضی ہے۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے پیشوا اور مسلّم امام ابو الحسن عبید اللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ اور اس طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے۔

(تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ محمد الخضری مرحوم)

یہ فقہ، عباسیوں کے دورِ ملوکیت میں مدوّن ہوئی تھی، اس لئے اس کا اُس ماحول سے متاثر ہونا فطری تھا۔ پھر یہ کتنی ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو، بہر حال انسانوں کی مرتب کردہ تھی۔ اس لئے اس میں سہو و خطا کا امکان تھا۔ لہٰذا یہ قرآن کی طرح ابدی اور غیر متبدّل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے متعلق عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ یہ ابدی بھی ہے اور غیر متبدّل بھی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام سمٹ سمٹا کر فقہ کے اندر آ چکا ہے جس میں نہ فکر و تدبّر کی گنجائش ہے نہ کسی قسم کی اصلاح اور ترمیم کا امکان۔ اس سے قرآن ہی عملاً مفقود نہیں ہوا، اسلام بھی دین کے بجائے مذہب بن کر رہ گیا۔ وہی مذہب جسکی (ہندوستان میں مُبینہ) آزادی کے دعویٰ کی بنا پر ان علماء کا موقف یہ تھا کہ اسلام کے احیاء کے لئے الگ مملکت (پاکستان) کی ضرورت نہیں۔

محترم جنرل ضیاء الحق برسرِ اقتدار آئے تو وہ مذہبی آدمی تھے، اور فقہ حنفی کے پابند۔ اس سے، اس فقہ کے لئے مملکت کا قانون بن جانے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ جب کوئی مملکت، مذہب کو اپنا آئین قرار دے لے تو وہ مذہبی پیشوائیت کی دست نگر ہو جاتی ہے۔ اسی کو تھیاکریسی کہتے ہیں۔ دین میں، مملکت، قرآن کریم کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، امت کے مشورہ سے، جو قوانین خود مرتب کرتی ہے (انہی کو قوانینِ شریعت کہا جاتا ہے) اسی لئے اسے، شریعت کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے نہ کسی کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو دین کی حکومت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ لیکن مذہب میں، مملکت کو مذہبی پیشوائیت سے پوچھنا پڑتا ہے کہ معاملہ زیرِ نظر میں شریعت کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مذہبی حکومت میں، نہ حکومت کو اس کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ کسی معاملہ کے متعلق غور و فکر کے بعد فیصلہ دے سکے کہ وہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اور نہ ہی علماء کو اس کی آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ از خود کوئی فیصلہ کر سکیں۔ حکومت اس کی پابند ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ کے متعلق علماء سے دریافت کرے کہ اس کے لئے شریعت کا فیصلہ کیا ہے اور یہ (علماء حضرات) اس کے پابند ہوتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ اس باب میں کتبِ فقہ میں کیا لکھا ہے۔ اس لئے اس نظام میں غور و فکر کی صلاحیتیں مسلوب ہو جاتی ہیں۔ (یہ وجہ تھی جو مودودی (مرحوم) نے کہا تھا کہ فقہ نے اسلام کو مسجد شاستر بنا کر رکھ دیا ہے)۔ اس سے فکر و تدبّر کی صلاحیتیں، اربابِ اقتدار یا ارکانِ مذہب ہی کی سلب نہیں ہو جاتیں، بلکہ ساری قوم کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ (مثلاً) جب یہ سوال سامنے آئے کہ کوئی مسلمان مرنے کے بعد اپنی آنکھ کا عطیہ دے سکتا ہے یا نہیں کہ اسے کسی نابینا کی آنکھ میں پیوست کر دیا جائے، تو اس پر نہ عقل و فکر کی رُو سے (ON MERIT)

گفتگو کی جا سکتی ہے نہ ڈاکٹری نقطہ نگاہ سے۔ جب گوشۂ مذہب کی طرف سے آواز آجائے کہ ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے تو اس کے بعد نہ آپ عقل و فکر کی رُو سے کچھ کہہ سکتے ہیں نہ حکومت کچھ کر سکتی ہے! یہ ہے تھیاکریسی۔ یہ حضرات اربابِ حکومت کو باور کراتے (بلکہ یقین دلاتے) رہتے ہیں کہ ہمارے بتائے ہوئے جو احکام آپ نافذ کر رہے ہیں وہ خود خدا کے احکام ہیں۔ چنانچہ جب جنرل ضیاء الحق صاحب نے حدود سے متعلق قوانین نافذ کئے تو مودودی (مرحوم) نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ

اب ہمارا یہ فریضہ ہے کہ عوام الناس کو یقین دلائیں کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۷۹ء صـ۱)

(بحوالہ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۷۹ء صـ۳۷)

(معاذ اللہ)۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک اعلان بھی شائع کیا تھا جو ایشیا بابت ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء صـ۹ پر چھپا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدائے تعالیٰ اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

اس طرح یہ حضرات اربابِ اقتدار کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیتے ہیں کہ اُن کے احکام، خدا اور رسولؐ کے احکام ہیں۔ اور انہیں باور کرا دیتے ہیں کہ وہ امور من اللہ ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ حدود سے متعلق جو احکام نافذ کئے گئے تھے، ان کے متعلق محترم صدرِ مملکت نے خود اعتراف کیا تھا کہ وہ ناممکن العمل ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے نہ انہیں واپس لیا۔ نہ ان میں کوئی ترمیم کی۔ بلکہ وفاقی شرعی عدالت نے جب رجم کے قانون کو خلافِ شریعت قرار دیا تو انہوں نے عدالت کو اس پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے کہا اور مطمئن نہ ہوئے جب تک اس (نئی) عدالت نے فیصلہ نہ دے دیا کہ وہ مطابقِ شریعت ہے۔ یہ اس لئے کہ صدرِ محترم کو یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ یہ احکام خدا کے احکام ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ہم نے جو کہا ہے کہ صدرِ مملکت کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ یہ احکام خداوندی ہیں تو یہ اس لئے کہ صدرِ مملکت نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ علومِ شریعت کے ماہر ہیں۔ اس لئے انہیں لامحالہ ان حضرات کے فیصلہ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

ربوٰ کو قرآن کریم نے سنگین ترین جرم قرار دیا ہے ——— ایسا سنگین کہ اس نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ اس پر مُصر رہیں تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔ ربوٰ کہتے کسے ہیں اسے قرآن کریم نے چار لفظوں میں واضح کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم نے کسی کو کچھ دیا ہے تو ——— فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (۲/۲۷۹) "تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے زائد کچھ نہیں"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے، اصل زر سے کچھ زائد لینا ربوٰ ہے خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن فقہ نے اس کی متعدد شکلوں کو شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب قرار دے رکھا ہے۔ مزارعت (کاشتکار سے فصل کی بٹائی لے لینا)۔ مضاربت (کسی کے کاروبار میں روپیہ۔ INVEST۔ کر کے اس کے منافع میں شریک ہو جانا) فقہ کی رُو سے ربوٰ نہیں۔ حتیٰ کہ کسی

محتاج، غریب کو ذاتی قرضہ دے کر اس سے زائد رقم وصول کر لینے کو بھی جائز قرار دیدیا گیا۔ اس پر آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی۔ لیکن ہے یہ حقیقت۔ مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری صاحب نے ایک کتاب شائع فرمائی ہے جس کا نام ہے "معاشیات نظام مصطفیٰ ؐ"۔ اس میں سُود کے خلاف اسلامی احکام کا ذکر کرنے کے بعد سُود کے گناہ سے بچنے کی تدابیر درج کی گئی ہیں۔ دو ایک تدابیر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:-

پہلی تدبیر: ——— ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سُود ہونگے۔ لیکن اس جُرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید لے اور اُسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدّت معینہ کے لئے بارہ روپے میں اُدھار بیچ دے۔ اس مدّت کے بعد قرض لینے والا، قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کر دے۔ اس فقہی حیلہ سے یہ زائد دو روپے حلال وطیب قرار پا جائیں گے۔

دوسری تدبیر: ——— قرض دینے والا اپنی کوئی چیز ایک سو دس روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ اُدھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ ایک سو روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس چیز کو اُس شخص سے سو روپے میں خرید لے۔ اس طرح وہ چیز بھی قرض دینے والے کو واپس مل گئی اور قرض لینے والے کے ذمّے ایک سو دس روپے واجب الادا ہوگئے۔

تیسری تدبیر: ——— قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز دو سو روپے میں اُدھار بیچ دے۔ پھر اُسے اس سے ایک سو روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا معینہ مدّت کے بعد اس شے کی قیمت کے طور پر اُسے دو سو روپے ادا کر دے گا۔ اس طرح اُسے ایک سو روپیہ زائد مل جائے گا جو بالکل حلال اور طیب ہوگا۔

ان تدابیر کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:-

امام ابو یوسف (علیہ الرحمۃ) ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔

(بحوالہ فتاویٰ قاضی خان مع عالمگیری۔ جلد دوم۔ ص $\frac{۲۷۹}{۲۸۰}$ مصری)

امام یوسف ؒ کی اس رائے کو نقل کرنے کے بعد فاضل مصنّف فرماتے ہیں:-

لیکن افسوس کہ مسلمان دینِ فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سُود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں ...

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو   دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارے (صفحہ ۱۷۲)

لیکن محترم مفتی صاحب کو اب افسوس نہیں رہے گا۔ پاکستانی مسلمان نے فطرت کے اشارے کو اسطرح سمجھا ہے، اور اس انداز سے شاہین بنا ہے کہ اس نے حلال اور حرام کی تمیز ہی ختم کر دی ہے۔ اقبالؒ نے (اپنے) شاہین کے متعلق کہا تھا کہ وہ شکارِ مُردہ کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتا۔ لیکن ہمارے یہ شاہین بچّے، مردہ اور زندہ سب پر بلا دریغ جھپٹ رہے ہیں۔ جس دبدبہ اور طنطنہ سے پاکستان میں ربٰو کا کاروبار ہو رہا ہے اس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملے گی۔ یہ اس لئے کہ اب شریعت نے اس سب کو حلال قرار دے رکھا ہے۔

قیامت بالائے قیامت کہ بنک میں جمع شدہ رقم پر سُود ملتا ہے۔ اصل زر اور سود کی مجموعی رقم سے اڑھائی فی صد وضع کر لیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ جس مال سے زکوٰۃ وضع کر لی جائے وہ حلال اور پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کا ذکر آ گیا تو ایک اور تلخ حقیقت بھی لوحِ قلم پر آ گئی۔ سیکولر حکومتوں میں ایک ہوتے ہیں پرسنل لاز اور دوسرے ہوتے ہیں پبلک لاز۔ ہماری اسلامی جمہوریہ کے دستور میں بھی یہ تفریق رکھی گئی ہے (جو کہ اسلام کے خلاف ہے)۔ پرسنل لاز ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوتے ہیں، لیکن پبلک لاز کا اطلاق مملکت کے تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ حکومت نے زکوٰۃ کا قانون پبلک لا کی حیثیت سے نافذ کیا، لیکن شیعہ حضرات نے اپنے فرقہ کو اس سے مستثنیٰ قرار دلوایا۔ اب عُشر کے قانون کے متعلق بھی ایسا ہی کہا جاتا ہے یعنی اس مملکت میں پرسنل لاز ہی نہیں، پبلک لاز بھی ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے۔ اسلامی حکومت تو ایک طرف، اس قسم کی تفریق سیکولر حکومت میں بھی نہیں ہوتی۔ لیکن جب مذہب اقتدار کی شکل اختیار کر لے تو اس میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

شیعہ نقطہ نگاہ کے متعلق، تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے لیڈر مفتی جعفر حسین صاحب کا ایک تفصیلی انٹرویو، روزنامہ جنگ لاہور کی ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم اس میں سے موضوع زیرِ نظر سے متعلق نکات اخذ کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "ہم حکومت کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں سمجھتے"۔

اسلامائیزیشن کے سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "یہ جو کہا جا رہا ہے کہ یہ اسلام ہے تو ہم اسے صحیح اسلام تسلیم نہیں کرتے۔ ہم ان کی طرف سے عائد کردہ زکوٰۃ کو صحیح اسلامی ٹیکس کہنے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں حدود آرڈیننس پر بھی اعتراض ہے۔ اس کی تجویز کردہ سزاؤں پر اور اس کے طریق کار پر"۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "اسلام میں مارشل لا کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور جو حکومت اسلامی نہیں اس کے اقدامات کسطرح اسلامی ہو سکتے ہیں"۔

مفتی صاحب سے پوچھا گیا کہ آیا شیعہ سنی فقہی اختلافات کا کوئی حل ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ "اختلافات طبعی چیز ہے۔ یہ اختلاف کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے کی فقہ کو کوئی قبول نہیں کرے گا"۔

انہیں بتایا گیا کہ ایک تجویز یہ ہے کہ ایک متفق علیہ فقہ مرتب کر لی جائے جسے فقہ پاکستان کہا جا سکتا ہے۔ اس پر آپ کی کیا رائے ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ "کوئی فقہ مرتب نہیں کی جا سکتی اور ایسا کرنا نادانی ہوگا۔ یہ بے معنی تجویز ہے"۔

یہ ہے یہاں پبلک لاز کے متعلق اختلافات کا عالم! حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی شخص ان امور کو (SERIOUSLY) لے نہیں رہا۔ سب وقت کو دھکا دینے کی فکر میں ہیں۔

مذہب کی پیدا کردہ ایک اور خرابی اس سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ دین کے پروگرام کے کچھ عناصر ہوتے ہیں جو اس کے پیشِ نظر مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ صلوٰۃ، قرآن کے الفاظ میں، معاشرہ میں

برائیوں اور بے حیائیوں کا سدباب کر دیتی ہے۔ وہ معیشت میں اجتماعیت پیدا کر دیتی ہے۔ رزق کے راستے میں کسی نے جو بند لگا رکھے ہوں، وہ انہیں توڑ ڈالتی ہے۔ صوم (روزہ) قوم کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ نظامِ خداوندی کو انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب کر دے۔ حج کا اجتماع، پوری نوعِ انسانی کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آکر دیکھیں کہ نظامِ خداوندی اُن کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ قرآن کریم کی تعلیم کی پیروی (تلاوت) سے ہوتا ہے۔ (تلاوت کے بنیادی معنی پیروی کرنے کے ہوتے ہیں)

لیکن جب دین مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو دین کے مقاصد کے حصول کے یہ تمام ذرائع مقصود بالذات بن جاتے ہیں۔ اگر فقہ کی شرائط کے مطابق نماز ادا کر لی جائے تو صلوٰۃ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت دیگر ارکان کی ہے۔ ان کی محسوس شکل و صورت کی ادائیگی کر لی جائے تو وہ اطمینان دلا دیتا ہے کہ تم نے فریضۂ خداوندی ادا کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، وہ ان میں سے ایک ایک کا ثواب اس قدر عطا کرتا ہے کہ انسان کو اپنی نجات و سعادت کے لئے کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ پہلے تو یہ باتیں وعظوں کے وعظ تک محدود ہوتی تھیں۔ اب ریڈیو اور ٹیلی وژن اور دیگر ذرائع ابلاغ نے ان کا چرچا عام کر دیا ہے۔ ہر روز بتایا جاتا ہے کہ ایک نماز قاعدے کے مطابق پڑھ لی جائے تو اتنے برسوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جمعۃ الوداع کا ایک روزہ عمر بھر کی نیکیوں سے زیادہ گراں بہا ہوتا ہے۔ ایک حج سے ساری عمر کے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ جو شخص مسجد بنوا دے، اُس کے لئے جنت میں موتیوں کا محل مختص ہو جاتا ہے۔

قرآن ایک ضابطۂ ہدایت تھا، جسے پڑھا اس لئے جاتا تھا کہ اسے سمجھا جائے، اور سمجھنا اس لئے ضروری تھا کہ اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ مذہب نے یہ سکھایا کہ اس کا سمجھنا ضروری نہیں۔ اس کے بلا سمجھے پڑھنے سے ایک ایک حرف کے بدلے دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے (یعنی الٓمٓ کے تین حروف ہیں۔ اس کے پڑھنے سے تیس نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ اس سے پورے قرآن مجید کے (بلا سمجھے، صرف الفاظ کے دُہرانے) سے جس قدر ثواب مل سکتا ہے وہ حد و حساب سے باہر ہے۔ یوں تو اسے سارا سال اسی طرح پڑھا جاتا ہے۔ لیکن رمضان شریف میں یہ (تلاوت) اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ تراویح میں ختمِ قرآن۔ اس کے بعد آخری تین راتوں، بلکہ ایک رات میں شبینہ۔ شبینہ میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں نمازی شریک ہوتے ہیں۔ نہ پڑھنے والے (حافظ) کو علم ہوتا ہے کہ جو کچھ میں پڑھ رہا ہوں اس کا مطلب کیا ہے، نہ سننے والے مقتدیوں کو معلوم کہ جو کچھ ہم سن رہے ہیں اس کے معنی کیا ہیں۔ لیکن اس کے ثواب کی اس قدر داستانیں دُہرائی جاتی ہیں کہ لوگ ساری ساری رات کھڑے ہو کر اسے سنتے ہیں۔ اور بار بار سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ شبینہ گاہوں کی تزئین و آرائش پر جس قدر صرف کیا جاتا ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس سے عوام کے جذبات کی تسکین تو ہو جاتی ہے، لیکن قرآن کے مقصود و منطوق کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی اہمیت اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی ہے کہ لوگ قرآن کے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اس کی اسی اہمیت کا نتیجہ ہے کہ ملک میں ناظرہ قرآن پڑھانے والے مکتب، حفظ کرانے والے مدرسے، قرأتیں سکھلانے والے دار العلوم ہر سال کثرت سے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے یہ کچھ خال خال ہوتا تھا۔ اب اس تکرار و اصرار سے ہوتا ہے کہ قوم جذبات کے سمندر میں غرق رہتی

ہے۔ اور اس طرح ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

کے پروگرام پر پورا پورا عمل ہوتا ہے

اس قسم کی مذہبیت کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے۔ اس سے جرائم میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب کسی کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا جائے کہ یہاں مسجد بنا دینے سے جنت میں موتیوں کا محل مل جاتا ہے تو وہ (حرام۔ حلال کمائی سے) ایک مسجد تعمیر کرا دینے کے بعد مطمئن ہو جائے گا کہ میں اب جو جی میں آئے کروں، جنت میری ملکیت ہو چکی ہے۔ جسے بتا دیا جائے کہ زکوٰۃ دینے سے باقی مال حلال و طیب ہو جاتا ہے تو اس کے بعد وہ مال جمع کرنے میں جائز و ناجائز کی تمیز کیوں کر لگا؟ جسے کہہ دیا جائے کہ حج کرنے سے سابقہ زندگی کے سب گناہ دھل جاتے ہیں، تو اس کے دل میں گناہوں کی کھٹک کسطرح رہ سکتی ہے؟ مساجد کی تعمیر و تزئین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں۔ مکتبوں مدرسوں، دار العلوموں کے لئے عطیات دینے والوں، ہوائی جہاز کے ذریعہ بار بار حج کرنے والوں، خانقاہوں میں نیاز کی دیگیں پکوانے والوں اور مزارات پر طلائی، نقرئی چادریں چڑھانے والوں اور انہیں غسل دینے کے لئے منوں عرق گلاب لنڈھا دینے والوں کی کمائی کا جائزہ لے کر دیکھئے کہ اس میں کس قدر حصہ "فضل ربی" کا ہوتا ہے۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے عذاب جہنم کے سلسلے میں احبار و رہبان (علماء و مشائخ) اور سرمایہ دار طبقہ کو (آیت ۹/۳۴ میں) ھم قوس (اکٹھا) کیوں رکھا ہے؟ ان دونوں میں کونسا رشتہ ہے جس کی وجہ سے انہیں جہنمی رفیق قرار دیا ہے؟ بات واضح ہے کہ مذہبی پیشوائیت کی تائید کے بغیر نہ ملوکیت پنپ سکتی ہے، نہ سرمایہ داری سانس لے سکتی۔ وہی انہیں جنت کی بشارتیں دے کر، ناجائز راستوں پر گامزن رہنے کے لئے، ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے دلکش محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک سرمایہ پرست سے، جو جائز و ناجائز طریق سے دولت سمیٹتا جاتا تھا، اس کے نیکوکار رفیق نے کہا کہ کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا کہ تم نے قیامت کے دن اس کمائی کا حساب دینا ہے؟ اس نے کہا: مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (۱۸/۳۶) "اوّل تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ قیامت وغیرہ یونہی ڈراوے کے لئے ہے، حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوگا"

آیت کے باقی حصہ تک جانے سے پہلے، اس کے جواب کے اتنے حصے پر ہی غور کیجئے! کیا ہمارے ہاں کے جائز اور ناجائز طریق سے مال و دولت سمیٹنے والے اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اس کا حساب دینا ہے؟ زبان قال سے وہ ایسا نہ بھی کہیں، لیکن کیا زبان حال سے بھی نہیں کہتے کہ یہ سب افسانے ہیں، حقیقت میں ایسا نہیں ہوگا؟

اس کے بعد اس نے کہا: وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا (۱۸/۳۶) اگر مجھے خدا کے حضور جانا ہی ہوا تو تم دیکھ لینا کہ مجھے وہاں اس دنیا سے بھی بہتر مقام حاصل ہوگا! میں نے اس کا انتظام کر رکھا ہے۔ میں نے صدقہ۔ خیرات۔ زکوٰۃ۔ نذر و نیاز دے کر جنت خرید رکھی ہے۔ مجھے جنت فروش مذہبی پیشوائیت نے اس کی ضمانت دے رکھی ہے۔ اس لئے ہم یہاں بھی عیش کرتے ہیں، وہاں بھی عیش کریں گے!

آپ نے غور فرمایا کہ واعظوں کا بخشش اور مغفرت کا دلایا ہوا اطمینان سرمایہ دار کی جرأتیں کس قدر بیباک کر دیتا ہے؟ یوں ان کے دل سے محاسبہ کا ڈر اور مؤاخذہ خداوندی کا خوف نکل جاتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت ہر جگہ یہی کچھ کرتی ہے۔ عیسائی پادری جس طرح معافی ناموں (INDULGENCES) کے ذریعے جنت بیچا کرتے تھے، اس کی تفصیل ان کے لٹریچر میں عام ملتی ہے۔ وہ جنت فروشی کے سارٹیفکیٹ ہاتھ میں لئے آوازیں لگاتے پھرا کرتے تھے کہ

> آؤ! بدنصیبو جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ اگر تم اب بھی داخل نہ ہو سکے تو کب داخل ہوگے تم بارہ پنس کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے ناخلف ہو کر اپنے باپ کے لئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے؟
>
> (مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں صفحہ ۶۸)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ

> "گنہگار ہر جگہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے تھے کہ میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ میں خدا کے حضور کتنے گناہ کرتا ہوں کہ میں ہر وقت، بلا دقت ہر گناہ اور ہر جرم کے لئے معافی نامہ خرید سکتا ہوں" (ایضاً صفحہ ۷۰)

اسی بنا پر (DR. INGE) نے کہا ہے کہ

> جس عہد میں کلیسا سیاسی طور پر صاحب اقتدار رہا، وہی عہد سب سے زیادہ بدمعاشیوں کیلئے بدنام رہا۔ (ایضاً صفحہ ۷۰)

ہم عیسائیت کی اس تاریخ کو پڑھتے ہیں تو ان کی جنت فروشی کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ خود ہمارے ہاں جنت کتنی سستی بکتی ہے! وہ تو پھر بھی جرم و گناہ کے لئے افراد کی جرأتیں بیباک کرتے تھے، ہمارے ہاں یہ کاروبار قومی سطح پر ہوتا ہے۔ (مولانا) ابوالکلام آزاد مرحوم نے (ترجمان القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۰۹ پر) مسلم کی حسب ذیل حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:-

> والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لذهب الله بكم ولجاء بقوم يذنبون فيستغفرون[۱]۔
>
> اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک ایسی قوم لے آئے گا جس کا شیوہ یہ ہوگا کہ گناہوں میں مبتلا ہو، اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت طلب کرے۔

۱؎ یاد رہے وہ روایات جن میں ذرا ذرا سی باتوں پر جنت کا اختصاص اور ہزار ہزار نیکیوں کے ثواب کے وعدے دیئے جاتے ہیں، زبانِ حال سے کہتی ہیں کہ وہ وضعی ہیں۔ حضورؐ ایسا فرما نہیں سکتے تھے۔

اس کے بعد آپ انگوٹھی کیٹیاں ٹھاتے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قوم میں فسق و فجور کیوں عام ہو رہا ہے اور جرائم اس کثرت سے کیوں پھیل رہے ہیں! جب قوم سے یہ کہہ دیا جائے کہ قربانی کے دُنبے کے ہر بال کے عوض سو سو نیکیاں ملتی ہیں، تو نیکیوں کے اس فلک پیما انبار میں جرائم کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے! اور اس پر طرّہ، گناہگاروں کے لئے خدا کی بخشش بے پایاں! اس قسم کی یقین دہانیوں کے بعد، گناہوں کی جرأت آموزی اور حوصلہ افزائی کے لئے کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ روایات اور پھر ان پر مبنی ہماری شاعری! الامان والحفیظ۔

نصیب ماست بہشت، اے خدا شناس برو۔ کہ مستحق کرامت گنہگار اند

اس کے برعکس، دین کی عمارت ہی قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ (خود لفظ دین کے ایک معنی مکافاتِ عمل کے ہیں)۔ اور یہ قانون اس قدر بے لچک ہے کہ (اور تو اور خود) حضور نبی اکرمؐ کا اعلان تھا کہ إِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)۔ "میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے خدا کی معصیت کی تو اس کے عذاب سے نہیں بچ سکوں گا"۔

الحاصل — دین نام تھا قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کو، علم و عقل کی روشنی میں معاشرہ میں نافذ کرنے کا۔ مذہب میں قرآن اور علم و عقل دونوں شجرِ ممنوعہ قرار پا جاتے ہیں اور خدا پرستی نام رہ جاتا ہے چند الفاظ کے دُہرانے اور چند رسومات کے ادا کر لینے سے جنت کا وارث بن جانے کا۔ جب مذہب کسی قوم پر مسلط ہو جائے تو وہ زندہ قوموں کی صف میں کھڑی ہونے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں اس مذہب یا اُس مذہب کا سوال نہیں۔ مذہب جہاں بھی ہو اور جس قوم میں بھی ہو، اُس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ جو قوم بھی مذہب کی گرفت میں تھی، اُس کا حشر یہی ہوا تھا۔ جب اُس نے مذہب کو چھوڑا تو سانس لینے کے قابل ہوئی۔ آپ دیکھئے۔ روس۔ چین۔ جاپان۔ یورپ اور امریکہ کے ممالک، حتیٰ کہ ہندوستان۔ جب اُنہوں نے مذہب کی قبا اُتار پھینکی یا اسے پرستش گاہوں کی چار دیواری میں محصور کر دیا، تو چاند تک پہنچ گئیں۔ اور ہمارے مقدسین بند کمرے میں بیٹھ کر، رؤیت ہلال کے فیصلے کرتے رہتے ہیں! یہ انسانیت کی حرماں نصیبی تھی کہ اُن کے پاس دین نہیں تھا، اس لئے وہ، مذہب کو چھوڑ کر، سیکولرازم کا نظام اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ لیکن اُنہیں، بہرحال، دنیا تو مل گئی۔ ہم (مسلمان) صدیوں سے مذہب کی گرفت میں ماخوذ چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ، تعداد کے لحاظ سے ہم اتنے کثیر ہیں۔ جغرافیائی پوزیشن نہایت اہم ہے۔ مسلم ممالک کی زمینیں قدرتی ذخائر سے مالا مال ہیں۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارا شمار دُنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ ہم روٹی تک کے لئے دوسری اقوام کے محتاج ہیں۔ ہم اپنی حفاظت کے لئے اُن کے دست نگر ہیں۔ سُپر پاورز کے سامنے ہماری حالت، ایں سو راندہ و آں سو درماندہ کی ہو رہی ہے۔ ہم قرضے لے کر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے مذہب پرستی کا۔ پاکستان کا خطۂ زمین اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں، مذہب سے پیچھا چھڑا کر دین کا نظام قائم کیا جائے۔ تاکہ خدا کے اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ کے وعدے ہمارے حق میں پورے ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے گزشتہ ہزار برس میں جو بڑی جرائم سرزد ہوئے ہیں، اُن کی سزا کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ یہاں دین نے تو کیا آنا تھا، ہم پر مذہب کی گرفت پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو گئی۔ اور اقبالؒ نے ڈرامائی انداز میں ابلیس کی زبان سے جو کہلوایا تھا کہ —

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے　　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

یہ حقیقت محسوس شکل میں ہمارے سامنے آگئی۔ مقامی طور پر ہماری زندگی کے ہر گوشے میں فساد ہی فساد نظر آتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر ہماری حیثیت بھیک منگوں سے زیادہ نہیں اس کے باوجود ہمیں یہ کہہ کر مطمئن رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہاں اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ یاد رکھئے! اسلام کی زندگی یا قوت ماپنے کا پیمانہ اس کے نام لیواؤں کی حالت ہوتی ہے۔ اگر ان پر مُردنی چھا رہی ہو تو ان میں اسلام زندہ نہیں کہلا سکتا۔ اسلام کو معیارِ زیست قرار دینے والے (خدا) نے اس کے نام لیواؤں سے کہا یہ تھا کہ اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴) "خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی"۔ اس نے اعلان کیا تھا: إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ (۳۶/۱۲) "ہم مُردوں کو زندگی عطا کر دیتے ہیں"۔ دین کی علمبردار قوم، زندگی کی قوتوں اور آرائشوں کی حامل تھی۔ یہی اسلام کے زندہ ہونے کی محسوس علامت تھی۔ دین کی حامل قوم خود زندہ ہوتی ہے اور دوسروں کو زندگی کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے برعکس مذہب پرست قوم اپنی لاش کو کندھوں پر اُٹھائے اس کے کفن کے لئے دوسروں سے بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ ایسی قوم سے غیرت و حمیت کا ایک ہی تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنی نسبت اسلام کی طرف نہ کرے کیونکہ اس سے اسلام دنیا میں بدنام ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے کس آہِ جگر سوز کے ساتھ کہا تھا کہ

"تا نداری از محمدؐ رنگ و بُو   از درودِ خود میالا نامِ اُو!"

"تقسیم ہند کے بعد ہم ادھر آئے تو ہم نے قوم سے پہلی بات یہی کہی تھی کہ تحریک پاکستان ایک قانونی جنگ تھی جسے ہمارے عظیم القدر رہنما کی حسنِ تدبیر اور بلندیٔ کردار نے جیت لیا۔ اس وقت اتنی فرصت نہیں تھی کہ قوم کی ذہنیت کی تبدیلی اور نظریات کے تغیر کے لئے کچھ کیا جاتا۔ اگر ہماری قوم اسی ذہنیت کو لے کر آگے بڑھی تو ہم کبھی وہ مقاصد حاصل نہیں کر سکیں گے جن کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے"۔ اور یہ کہ "نفسیاتی تبدیلی کے بغیر قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ یہ خدا کا قانون ہے" (۱۳/۱۱)۔ اس "تغیرِ نفس" کے لئے حضورؐ نے (ہدایاتِ خداوندی کی رو سے) جو پروگرام اختیار فرمایا وہ "تعلیم کتاب و حکمت" تھا۔ (۶۲/۲) یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم۔ طلوعِ اسلام نے اربابِ اسباب سے کہا کہ قوم کے موجودہ افراد کو ان کی حالت ...... پر رہنے دیجئے۔ ان کے ذمے اس خطۂ زمین کی حفاظت کا فریضہ عائد کیجئے، اور آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیجئے کہ مملکتِ پاکستان کے مقاصد و غایات (یعنی اقدار و اصولِ خداوندی) ان کے دل کی آواز بن جائیں لیکن قوم کے اعیان و ارکان اس قدر لوٹ میں مصروف تھے کہ اس ارشادِ خداوندی اور سنتِ نبویؐ پر عمل پیرا ہونا تو ایک طرف، انہوں نے اس آواز پر غور کرنے کی زحمت تک بھی گوارا نہ کی۔ مدرسوں اور کالجوں میں سیکولرازم کی تعلیم جاری رہی جس میں مستقل اقدار کا ذکر تک نہیں آتا اور مکتبوں اور دارالعلوموں میں وہ تعلیم جس سے عقل و فکر کے چراغ گل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہر دو تصورات باہم دگر اس قدر متغائر اور متضاد تھے کہ قوم کے ان دونوں بازوؤں میں حریفانہ کشمکش پیدا ہو گئی۔ قدامت پسند طبقہ نئی نسل کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گیا، اور نوجوان طبقہ اس مذہب کو دیکھ کر جسے یہ حضرات اسلام کے نام سے پیش کرتے تھے، خود نفسِ اسلام ہی سے متنفر ہو گیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں قدامت پرست طبقہ اس میکانیکل اسلام پر (مطمئن ہی نہیں) نازاں ہے جس میں نہ دین ہے نہ دنیا اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ، اس "اسلام" سے بیزار ہو کر کمیونزم کی آغوش میں جانے کے لئے ذہنی طور پر تیار بیٹھا ہے (اور یہ بڑا مہیب خطرہ ہے) تاریکیوں کی اس مایوس کن فضا میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن پرویز صاحب کی پیش کردہ اس کابچہ۔

کی اسکیم تھی جس کا مقصد طلباء کے قلب نگاہ میں قرآنی تغیر پیدا کرنا تھا۔ لیکن ہماری حرماں نصیبی کہ عین اس وقت جب وہ اسکیم برگ و بار لانے کے قابل ہوئی ۱۹۵۸ء کا وہ آرڈیننس جاری ہو گیا جس کی رُو سے نئے کالج کھولنے پر پابندی لگا دی گئی۔ ایک عرصہ تک توقع رہی کہ وہ پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ آرڈیننس ابھی تک نافذ العمل ہے۔ یوں روشنی کی وہ ہلکی سی کرن بھی تاریکیوں کے اس بحرِ زخار میں ڈوب گئی، اور اس طرح اس قوم کی مرگِ جاوید کی نوحہ خواں بن گئی جس کی حالت یہ ہوتی ہے:

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے، یا رہتی ہے خام

(ارمغانِ حجاز)

ایسی قوم میں اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو سطحِ آدمیت پر بھی فائز نہیں ہوتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ "خدا تک پہنچنے کے لئے" سطحِ آدمیت اوّلین زینہ ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

ممکن نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو تیری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام!

مقامِ آدم یہ ہے کہ فطرت کی قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں، اور مقامِ مومن یہ کہ وہ فطرت کی قوتوں کو اپنے جلو میں لئے، قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ اس کا نام اسلام ہے جو دنیا کے کسی ملک میں بھی نظر نہیں آتا۔ پاکستان کا خطۂ ارض اسی اسلام کے احیاء کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ ہمارا خواب تھا! اس خواب کی تعبیر کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ:

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں!

یہ ہے ماحصل ہماری پچاس سالہ جدوجہد کا! جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ!!

اگر کسی کے دل میں حقیقی اسلام کے احیاء کی آرزو ہو، تو اس کے لئے آغازِ کار، تغیرِ نفس (ذہنیت کی تبدیلی) کے لئے تعلیم و تربیت کا پروگرام ہوگا۔ اس کے سوا احیاءِ اسلام کی کوئی صورت نہیں۔

آخر میں ہم ایک بار پھر واضح کر دیں (جیسا کہ متعدد بار پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے) کہ ہر چند مملکتِ پاکستان ابھی تک اسلامی نہیں بن سکی، اس خطۂ زمین کا محفوظ رہنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ زمین محفوظ رہے گی تو اس میں اسلامی مملکت کے قیام کا امکان رہے گا۔ زمین ہی نہ رہے گی تو یہ امکان بھی ختم ہو جائے گا۔ دستورِ پاکستان میں اسے "اسلامی جمہوریہ" کہکر پکارا جائے تو اسے صرف دستوری اصطلاح سمجھنا چاہئے اور اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے مملکت، اسلامی بن گئی ہے۔ مملکت اس وقت فی الحقیقت اسلامی کہلانے کی مستحق ہوگی جب اس میں اقتدارِ اعلیٰ کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو نہیں بلکہ خدا کی کتاب کو حاصل ہوگا۔ یہی دستورِ پاکستان کی اساس ہونی چاہئے۔ یہی مملکت کا آئین۔ اس کے بغیر نہ کوئی دستور اسلامی ہو سکتا ہے نہ مملکت اسلامی۔ مملکت کی اس اساس سے دستورِ پاکستان کے متعلق جس قدر اختلافات ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گے اور قانون سازی کے ضمن میں جو پیچیدگیاں ہیں ان کا حل بھی مل جائیگا۔ لیکن اس کے لئے شرطِ اوّل "یقین" کا ہونا ہے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جیسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار بابانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-	نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں -
لاہور	جمعہ ۸ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰	
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896	
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر (بمقام)	227/229 ALUMROCK ROAD 3B 3BH, بذریعہ V.C.R	
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے شام ۴ بجے (بمقام)	MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE. 7/OSLO-1 بذریعہ V.C.R	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827	
کراچی صدر	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	بذریعہ V.C.R. دارالتحریر (بالائی منزل) بالمقابل شاپ نمبر ۲ - سرحد بلڈنگ	
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیق پین صدر (OPP. V.I.P. MAIN GATE) پشاور چھاؤنی بازہ روڈ فون ۷۴۴۵۹	
	۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ثریا محل B-3 یونیورسٹی ٹاؤن	
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب - اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۷۷ لیاقت روڈ	
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر ٹیکنیکل انجینئرنگ ورکس - شہید روڈ لیہ	
ایبٹ آباد	۱- ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب - واقع 234-K-L کیہال (ایبٹ آباد)	
	۲- ہر اتوار ۳ بجے سہ پہر	رہائش گاہ غلام مصطفےٰ اعوان صاحب واقع K-365 - گنج گراؤنڈ - ایبٹ آباد	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی ٹی مکان نمبر ۴ - نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ - عثمان پورہ باہتمام ڈاکٹر انجینئر محمد اعظم خان صاحب -	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو ہیلتھ کلیکشن سنٹر توغی روڈ باہتمام غلام صابر صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام رہائش گاہ : چوہدری مقبول شوکت - گلی روڈ سول لائنز	
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و اتوار ۴ بجے سہ پہر بمقام ۲/۱۲ راجہ روڈ	باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ	
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام بازار کلاں - و بذریعہ V.C.R ٹیلی ویژن پر رہائش ڈاکٹر اکرم مرزا جناح کالونی گجرات -	
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر شاہ نسز بیرون پاک گیٹ (فون : ۳۰۲۰۱)	
بجلی تحصیل کبیر والا خانیوال	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب نمائندہ بزم	
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۔۔)	
فیصل آباد	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	[illegible]	

باسمہٖ تعالیٰ

عیدِ محکوماں ہجوم مومنیں!

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

(پرویز صاحب کا خصوصی درس بتقریبِ
جشنِ نزولِ قرآن (جولائی ۱۹۸۳ء) جسے
عرفِ عام میں عید الفطر کہا جاتا ہے)۔

باسمہٖ تعالیٰ

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

(بتقریبِ "عید الفطر" ۱۹۸۳ء)

عزیزانِ گرامی قدر! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

میں اس (آنے والی) عید کے تصور میں گم، حال کے دریچوں سے ماضی کے مناظر کو جھانک رہا تھا کہ میرے سامنے ایک خطاب آیا جسے میں نے (عنوان بالا سے) آج سے چودہ سال پہلے (۱۹۶۸ء کی عید پر پیش کیا تھا۔ میں نے حالات پر غور کیا تو دیکھا کہ شامِ عید کی تیرگی پر میں نے جو خون کے آنسو بہائے تھے اس پندرہ سال کے عرصہ میں ان میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں۔ اُس وقت اگر ہلالِ عید ہمارے حال پر ہنستا تھا تو آج وہ قہقہے لگاتا ہے۔ اور اگر حقیقتوں پر پڑے ہوئے پردوں کو کچھ اور اُوپر اٹھایا جائے تو نظر آجائے گا کہ یہ پندرہ سال کی بات نہیں۔ قوم کے دھڑکتے ہوئے دل، علامہ اقبالؒ نے یہ بات آج سے بہتر سال پہلے کہی تھی اُس وقت سے اِس وقت تک کے حالات کا اگر آپ، بہ نگاہِ تعمق جائزہ لیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ہماری ہر عید سابقہ عید کے مقابلہ میں زیادہ غم آلود ہوتی چلی گئی۔ جس قوم کی یہ حالت ہو اس کی حرماں نصیبی کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اُس کے دل سے پوچھئے، اُس کے جگر سے پوچھئے۔ آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو۔

کیا جائیگا کہ خوشی کے موقعہ پر غم کی داستانیں کچھ اچھی نہیں لگتیں۔ درست اور بجا؛ لیکن میرے قلبِ حساس کی فغاں یہ ہے کہ تصنع کی ہنسی حقیقی آنسوؤں سے کہیں زیادہ کرب انگیز ہوتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی فن کارانہ شعار اختیار نہیں کیا کہ۔ جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور! لہٰذا مجھے، اس داستانِ غم کے دہرانے کی اجازت دیجئے۔ ویسے بھی

مرا رونا نہیں، رونا یہ ہے سارے گلستاں کا

میں پندرہ سال پہلے کے نوحۂ غم کو مناسب ترمیمات کے ساتھ پیش کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔

بنیادی طور پر لفظ عید کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے والا واقعہ، لیکن اصطلاحاً اس سے مراد ہے وہ جشنِ مسرت

جو بار بار آئے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے، اور وہ ہے وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰؑ کے جانثار حواریوں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے "مائدۃ من السماء" اتارے تاکہ اس سے ہماری جسمانی پرورش کے علاوہ ہمارے قلوب کو بھی اطمینان حاصل ہو۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (۵/۱۱۴-۱۱۲) "اے ہمارے پروردگار! ہماری کھانے کا سامان" آسمان" سے عطا فرما تاکہ وہ رزق، اس جماعت کے اسابقون الاولون کے لئے بھی موجبِ جشنِ مسرت ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی — تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔" سوال یہ ہے کہ یہ مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ آسمان سے اترنے والا رزق — کیا تھا جس کی درخواست خدا سے کی گئی تھی اور جو ان سب کے لئے باعثِ جشنِ مسرت تھا۔ اہلِ جبہ پسندوں نے تو حسبِ معمول، اسے بھی ایک چیستان بنا دیا اور کہا کہ حواریوں کے لئے آسمان سے پکے پکائے کھانوں کا طشت اترا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس میں جو کھانے اترتے تھے اُن کی تفاصیل تک بھی دینے لگ گئے۔ لیکن جن کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جماعتِ مومنین جب "آسمان سے رزق" طلب کرتی ہے تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔

آسمان سے رزق

ایک رزق وہ ہے جو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رُو سے ملتا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس سے جسم تو زندہ رہتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور دوسرا رزق وہ ہے جس سے جسمِ انسانی کی نشوونما کے ساتھ، شرف و تکریمِ انسانیت کی بھی بالیدگی ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ایں خدا نانے دہد جانے بُرد
آں خدا نانے دہد جانے دہد

یہی وہ سماوی اقدار کے مطابق ملنے والا رزق تھا جس کے متعلق حواریوں نے کہا تھا کہ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا۔ وہ ہمارے لئے وجہِ زیست بھی ہو اور باعثِ اطمینانِ قلب بھی۔ مومن کے لئے باعثِ مسرت وہی رزق ہو سکتا ہے جس سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو — اور ظاہر ہے کہ مومن کو اطمینانِ قلب اسی زندگی میں حاصل ہو سکتا ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر ہو — اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳/۲۸) یہی تھا وہ رزق جسے اٰيَةً مِّنْكَ (۵/۱۱۴) کہا گیا تھا۔ یعنی خدا کے نظامِ ربوبیت کی صداقت کی نشانی اور اس کے خیر الرازقین ہونے کا ثبوت — یعنی وہ رزق جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محتاج ہو، نہ محکوم۔ جس میں عزت اور غیرت بیچ کر روٹی کا ٹکڑہ حاصل نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ رزق انہیں ملا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۵/۱۱۵) جو اس نظامِ رزق سے انکار اور سرکشی کی روش اختیار کریگا اس پر ایسا عذاب وارد ہوگا جس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

اس سے کفران کا نتیجہ

یہی وہ عذاب ہے جسے سورۂ نحل میں ایک مثال کے ذریعے یوں سامنے لایا گیا ہے کہ:

> خدا ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے اس کے رہنے والوں کو امن بھی حاصل تھا اور اطمینان بھی۔ اس کی طرف چاروں طرف سے رزق فراوانیوں سے کھنچے چلا آتا تھا لیکن انہوں نے ان انعاماتِ خداوندی سے کفر برتا اور نظامِ خداوندی کی جگہ اپنا خودساختہ نظام اختیار کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ (١٦/١١٢)

یہ انسانیت کی بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے مقدس ساتھیوں کی اصلی تصویر یا تو اُن کے نام لیواؤں کی عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں سے ڈھپ چکی ہے اور یا اسے افسانہ طرازیوں کے پردوں میں چھپا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ ہی نہیں سکی کہ وہ کیسے عظیم انقلاب کے پیامبر تھے اور انہوں نے کس طرح یہودی پیشوائیت کے خودساختہ نظامِ ہیکل اور رومیوں کے قصرِ حکومت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا تھا۔ اگر ان کی صحیح تاریخ سامنے آجاتی تو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کس قسم کا آسمانی نظامِ معیشت قائم کیا تھا جس سے انہیں انسانوں کا مرہونِ منت ہوئے بغیر سامانِ زیست میسر آتا اور ان کے لئے وجہ جشنِ عید بنتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود محرف انجیل میں بھی اس قسم کے اشارات ملتے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو معاشی نظام انہوں نے قائم کیا تھا اس کے نمایاں خط و خال کیسے تھے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس جماعت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں

انقلابِ عیسوی

کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ تمام سامانِ زیست مشترکہ استعمال کے لئے کھلا رکھا جاتا تھا۔ کسی کے پاس کوئی شے اس کی ضرورت سے زائد نہ تھی۔ "رسولوں کے اعمال" میں ہے:

> وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (سب مل کر خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے تھے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔
>
> (رسولوں کے اعمال ٢/ ٤٧-٤١)

یہ تھا وہ نظامِ رزق جسے انہوں نے مائدۃ من السماء (آسمانی اقدار کے مطابق رزق) کہہ کر پکارا تھا اور جس کے ملنے پر جشنِ عید منایا گیا تھا۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ الدین شروع سے آخر تک ایک ہی چلا آیا ہے۔ مختلف رسولوں کے زمانے میں، اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقوں میں فرق ہوتا تھا لیکن دین کی اصل وہی رہتی تھی۔ اس لئے، جس انداز زیست کی طرف، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے حوالے سے اشارہ کیا گیا ہے وہ انہی کی خصوصیت نہیں تھی۔ اصولی طور پر خدا کا ہر رسول اسی قسم کا انقلابی نظام قائم کرنے کے لئے آتا تھا جس میں "تیری اور میری" کا جھگڑا نہ رہے اور جو کچھ جماعت (یا اُمت) کے پاس ہو وہ سب کے لئے مشترکہ متاعِ زیست ہو۔ بنا بریں، جو نظام محمد رسول اللہ

والذین معہ کے مقدس ہاتھوں قائم ہوا تھا اس کی بنیادی خصوصیت بھی یہی تھی۔ کیا آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس روایت پر غور نہیں کیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "قبیلۂ اشعر کے ہاں یہ دستور تھا کہ جنگ کے زمانے میں، یا ویسے ہی جب ضرورت کا تقاضا ہوتا، قبیلے کے تمام افراد سارا سامانِ رزق ایک جگہ جمع کر لیتے اور اس میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اعتبار سے میں بھی قبیلہ اشعر میں سے ہوں" یہی تھا وہ آسمانی انقلاب جسے برپا کرنے کے لئے حضورؐ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تھا۔ قریش کے تاجروں،

رسول اللہؐ کی دعوت کی مخالفت

مہاجنوں اور کعبہ کے مجاوروں کی طرف سے جو اس دعوت کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی تھی تو اس لئے نہیں کہ اس میں ایک خدا کو تسلیم کرنے کی تعلیم تھی۔ اس سے ان کا کیا بگڑتا تھا؟ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ اس میں وحدتِ خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدتِ انسانیت کا نظریہ تھا۔ اس سے مساواتِ انسانیہ کا اصول سامنے آتا تھا جس کی رو سے مختلف افراد میں کسی قسم کی تفریق باقی نہیں رہتی تھی۔ "اللہ ایک ہے" کے عقیدہ سے انہیں کسی قسم کی پرخاش نہیں تھی انہیں مخاصمت تھی اس نظریہ سے کہ "تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ اور "تمام انسان ایک جیسے ہیں" کے نظریہ کا اوّلین عملی نتیجہ یہ تھا کہ سامانِ زیست میں تمام افراد یکساں طور پر شریک ہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کے سرچشموں پر . . . . سانپ بن کر بیٹھ جائے کہ دوسرے انسان اپنی روٹی تک کے لئے اس کے دستِ نگر اور محتاج ہو جائیں۔ ابوجہل نے غلافِ کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں سے جو فریاد کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نئے دین لانے والے کی قیامت خیزیوں کو دیکھو

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

یہ تھا وہ نظام، جسے ہر رسول پیش کرتا تھا اور جس کی مخالفت اس کی قوم کے سرمایہ دار طبقے کی طرف سے ہوتی تھی۔ قوم مدین نے حضرت شعیبؑ کے نماز پڑھنے کے خلاف اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ صلوٰۃ، انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں! آپ نے غور فرمایا کہ نظامِ خداوندی میں صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہوتا ہے؟ یہ نظام (خداوندی) دولت پر اپنا کنٹرول اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے مساواتِ انسانیہ قائم رہتی ہے۔ مساوات کے سلسلہ میں آپ غور کیجئے کہ محل میں پیدا ہونے والا اور جھونپڑی میں جنم لینے والا بچہ، دونوں، ایک جیسی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محل میں پیدا ہونے والا بچہ نہ اپنی پیٹھ پر سونے اور چاندی کی تھیلیاں

مساواتِ انسانیہ کا اصول

لاد کر لاتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی خداوندی دستاویز ہوتی ہے کہ ہم نے اُسے اتنے مربعے اراضی یا اتنے کارخانوں کا مالک بنا دیا ہے۔ دونوں بچے خالی ہاتھ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دونوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ایک جیسی ہوتی ہیں یعنی جن اشیاء پر ان کی زندگی کا مدار ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ہے مساواتِ انسانیہ کی بنیاد۔ لیکن انسانوں کا خود ساختہ غلط نظام، ان میں تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی تفریق کہ ایک انسان کے بچوں کو اتنا بھی میسر نہیں ہوتا

جتنا دوسرے انسان کے گوشت کو پلتا ہے۔ دینِ خداوندی اس تفریق کو مٹا کر مساواتِ انسانیہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے اور خدا کا رسول اس نظام کو عملاً متشکل کر کے دکھاتا ہے۔

روٹی کی اہمیت

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا مدار صرف "روٹی" (بنیادی ضروریاتِ زندگی) پر نہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسان کی طبیعی زندگی کا مدار روٹی ہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ خداوندی میں روٹی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب دنیا میں خدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھتے ہیں — یعنی توحید کا اوّلین مرکز قائم کرتے ہیں — تو اس کے بعد سب سے پہلی آرزو جو دعا بن کر ان کے لبوں تک آتی ہے یہی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (۲/۱۲۶) "اے میرے نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو پُرامن بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو ہر طرح کا رزق مہیا کر دے"۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں، رزقِ فراواں کو خدا کا انعام؛ اور بھوک کو اس کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس نے بنی آدم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا — جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی — وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ (۲۰/۱۲۴) اور جس کی یہاں روزی تنگ ہو گی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا کہ — لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (۷/۴۰) "ان پر آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے"۔ یہی تھا خدائے جلیل کا وہ اعلانِ عظیم جس کی تشریح میں نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا۔ کہ "جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، خدا نے اس بستی سے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا"۔ یہ کیا ہے؟ وہ عدمِ مساواتِ انسانیہ جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اگر اس بستی پر کوئی آفت آگئی تھی (اور ایسا بعض اوقات ہنگامی حالات میں ہو جاتا ہے) تو اس کے تمام باشندوں کو بھوکا رہنا چاہیئے تھا لیکن ایسا نظام جس میں بستی کے چند افراد تو پیٹ بھر کر کھا لیں لیکن دیگر افراد بھوکے رات کاٹیں، یہ اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے اس بستی پر خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ خدا تو اس نظام کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے جو اس کے قوانین کے مطابق متشکل ہو۔ وہ نظریۂ زندگی، وہ نظامِ حیات، وہ تہذیب، وہ تمدّن کبھی باقی نہیں رہ سکتا جس میں انسان اور انسان میں فرق کیا جائے، جس میں طبقاتی تقسیم ہو۔ فلاح اور بقا اسی نظریہ، اسی نظام، اسی تمدن کیلئے ہے جو بلا تفریق تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں باعثِ منفعت ہو۔ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ... (۱۳/۱۷) حقیقت یہ ہے کہ بھوکے آدمی کے لئے تمدنی ترقی کا کوئی شعبہ بھی وجہ کشش اور باعثِ طمانیت و تسکین نہیں ہو سکتا — کسی بھوکے آدمی کو جناح باغ لے جا کر بہار کی رنگینیاں اور کیف آفرینیاں دکھائیے، وہ انہیں کبھی (APPRECIATE) نہیں کر سکے گا۔ اسے بتائیے کہ ملک میں، بجلی اس قدر عام ہو گئی ہے

ملک کی ترقی کا معیار

کہ گھر گھر قمقمے جل رہے ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ سر بفلک عمارات کھڑی ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے گرانڈیل کارخانے مصروفِ گردش ہیں۔ فضا میں طیارے پرفشاں ہیں۔ زمین پر موٹریں محوِ خرام ہیں۔ وہ یہ سُن کر کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے لیکن — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی — بھوک میں بہار کی نزہت آفرینیوں اور بجلی کے قمقموں کی نور افشانیوں سے لطف اندوز

ہوتا تو ایک طرف، سعدی کے الفاظ میں، بھوکے کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب وہ رات کو نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سوچ میں غرق ہوتا ہے کہ ۔۔۔ چہ خورد بامداد فرزندم ۔۔۔ صبح میرے بچوں کو روٹی کہاں سے ملے گی اس سے بھی آگے بڑھئے! جاہلیہ عرب میں قبیلہ بنو حنیفہ نے آٹے کا ایک بت بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ لیکن جب قحط پڑا تو وہ اپنے اس "خدا" کو بھی کھا گئے۔ اور ایک قبیلہ بنو حنیفہ ہی پر کیا منحصر ہے! ہر بھوکا "اس خدا" کو کھا جاتا ہے جو اسے روٹی نہیں دیتا۔ روس کے انقلابیوں نے اسی طرح اس "خدا" کو کھا لیا تھا جس کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی مفلسی اور مفلوک الحالی کا ذمہ دار وہی ہے ۔۔۔ لہٰذا جس شخص کے پیٹ میں روٹی نہیں، جس کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں، جسے سر چھپانے کے لئے چھت میسر نہیں، جس کے پاس دم توڑنے والے بچے کے حلق میں ٹپکانے کے لئے دودھ کے چار قطرے نہیں، اس کے لئے دنیا کی کوئی جاذبیت وجہ سکون اور باعث دلکشی نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کے پاس اپنے بچے کے داخلہ کے لئے پیسے نہیں، اس کے لئے یہ خوشخبری کسطرح وجہ طمانیت ہو سکتی ہے کہ ملک میں دس ہزار اسکول کھل گئے ہیں اور دو ہزار کالج قائم ہو گئے ہیں۔ قوم کی ترقی کا معیار ایک اور فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں ہر ایک فرد کو کیا میسر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں چند انسانوں کو کیا کچھ حاصل ہو گیا ہے اور حاصل ہو رہا ہے ۔۔۔ جنت کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر سامانِ آسائش و آرائش ہے، ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔ جس جنت میں مساواتِ انسانیہ نہیں، وہ جنت نہیں، جہنم ہے۔

صرف خدا کی ملکیت

لیکن اس قسم کی عملی مساواتِ انسانیہ تو اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب رزق کے سرچشمے خدا کی ملکیت میں رہیں۔ افراد کی ملکیت میں نہ چلے جائیں۔ جنت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی زمین، اس کے چشمے، اسکی نہریں، اس کے باغات، افراد کی ملکیت ہوں گے کہ جس کا جی چاہے اپنے قطعۂ اراضی کو پٹہ پر دیدے اور جس کا جی چاہے، اسے گروی رکھ دے یا فروخت کر دے۔ توحید کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ سارے سلسلۂ کائنات کا واحد مالک خدا ہے۔ اگر اس کی ملکیت میں کسی اور شامل کر لیا جائے تو یہ شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہہ کر پکارتا ہے (۲/۲۲)۔ جب رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت تسلیم کر لی جائے تو جن لوگوں کی اپنی ملکیت نہ ہو، وہ ان مالکوں کے محتاج اور دست نگر ہو جاتے ہیں۔ اور محتاجی کا اگلا قدم ۔۔۔ یا یوں کہئے کہ فطری نتیجہ ۔۔۔ محکومی ہے۔ قرآن، اس تصور کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو جب وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا ۔۔۔ تم خدا کو چھوڑ کر جن کی محکومی اختیار کرتے ہو، جن کے تابع فرمان رہتے ہو وہ وسائلِ رزق کے مالک نہیں۔ اس لئے تم فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ ۔۔۔ رزق، خدا کے ہاں سے طلب کرو۔ وَاعْبُدُوْهُ ۔ اس طرح محکومی صرف اسی کی باقی رہ جائے گی۔ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (۲۹/۱۷) اور سپاس گزاری بھی اسی کی زیبا ہو گی۔ تم اپنے غلط نظامِ معیشت کی وجہ سے، دوسرے انسانوں کو ذرائع رزق کا مالک بنا دیتے ہو۔ پھر تم انکے محتاج و محکوم بھی ہو جاتے ہو اور رہینِ منت اور سپاس گزار بھی۔ اسطرح تم اپنے شرفِ انسانیت کو بیچکر اپنے بدن کو زندہ رکھتے ہو۔

رزقِ حلال

قرآن، اس طرح سے حاصل کردہ رزق کو حلال و طیب قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ كُلُوْا

رِمِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۔ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ (۱۶/۱۱۴) اگر تم انسانوں کی محکومی کے چنگل سے آزاد ہو کر صرف خدا کی محکومی اختیار کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے ۔ اور وہ یہ کہ تم رزق صرف خدا کے ہاں سے حاصل کرو اور اس طرح شکر گزار بھی اسی کے بنو ۔ یہی وہ رزق ہے جسے حلال و طیب کہا جائے گا ۔ یعنی مَا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔ وہ رزق جو تمہیں خدا کے ہاں سے ملے ۔ جس میں کسی انسان کی ملکیت کا دخل نہ ہو ۔ یہی تھا وہ حلال و طیب رزق جس کے لئے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے درخواست کی تھی اور جس کے حصول کے بعد جشنِ عید منایا گیا تھا ۔ اور یہی تھا وہ رزق طیّب جو اس رسولؐ آخر الزمان کے متشکل کردہ نظام کی وساطت سے حاصل ہوا تھا جس کی بعثت کے مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (۷/۱۵۷) وہ نوعِ انسان کے لئے رزقِ طیّب کو حلال قرار دے گا اور رزقِ خبیث کو حرام ٹھہرائے گا اور اس طرح ان اغلال و سلاسل کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑے چلی آ رہی تھی اور محتاجی و محکومی کی استحصال شکن رسموں کے بیچے دبی ہوئی تھی ۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ جو رزق نظامِ خداوندی کے تابع ملتا ہے اسے قرآن نے ہر جگہ "رزقٌ کریم" کہہ کر کیوں تعبیر کیا ہے ؟ اس لئے کہ رزق تو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رُو سے بھی مل ہی جاتا ہے ، لیکن وہ رزق ملتا ہے عزت اور توقیر ہیچکر ۔ لیکن خدا کی طرف سے جو رزق ملتا ہے اس میں تکریم و احترامِ انسانیت بھی باقی رہتی ہے ۔ اسی لئے یہ رزق ، "رزقِ کریم" ہوتا ہے ۔

انسانیت کُش نظام

دینِ خداوندی کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پا کر پروان چڑھ جائیں اور اس طرح وہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے ۔ یہ صلاحیتیں اسی صورت میں برومند ہو سکتی ہیں جب وہ سامانِ زیست کے لئے کسی انسان کا دست نگر نہ ہو ۔ رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لینے والی قوتیں اتنا ہی نہیں کرتیں کہ وہ لوگوں کو مفلس اور محتاج بنا دیتی ہیں ۔ وہ ان کی صلاحیتوں کو اُبھرنے نہیں دیتیں ۔ اس لئے کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے تابع فرمان کام کرنے والوں کی صلاحیتیں نشوونما پا گئیں تو وہ سر اُٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں گے اور انہیں حیوانات کی طرح دبا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا ۔ لہٰذا ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف حیوانی سطح پر زندہ رہیں ، انسانی سطح پر کبھی نہ آ سکیں ۔ فرعون نے بنی اسرائیل کی انسانی زندگی کو ذبح کرنے کیلئے یہی حربہ استعمال کیا تھا ۔ اس نے ان سے کہا تھا کہ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۔ الاعلیٰ ۔ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ، ان کے شرفِ انسانیت کو ذبح کر دینا مشکل نہیں تھا ۔

اور یہ "فرعونِ مصر" تک محدود نہیں ۔ دنیا کا ہر مستبد ، صاحبِ اقتدار ، یہی کچھ کرتا ہے ۔

رسول کے بعد

قرآن بتاتا ہے (اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ) خدا کا رسول اس قسم کا انقلابی نظام متشکل کر کے چلا جاتا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ، مفاد پرست گروہ پھر سے سر نکالتا اور اس نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا ۔ لیکن وہ تنہا ایسا نہیں کر سکتا تھا ۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملاتا ۔ یہ مذہبی پیشوا اس سلسلہ میں کیا ٹیکنیک اختیار کرتے ، اسے قرآن کریم نے داستانِ بنی اسرائیل کے ضمن میں

بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ ان کے ہاں کے بڑے بڑے لوگ (جو دولت اور قوت کے مالک بن بیٹھے تھے) کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے اور جب انہیں دشمن پکڑ کر لے جاتا تو پھر چندہ اکٹھا کرتے تاکہ ان کا فدیہ دے کر انہیں دشمن کی قید سے آزاد کرا لیا جائے۔ وہ انہیں اس طرح آزاد کرانے کو) بڑا ثواب کا کام سمجھتے۔ اگر مذہب پرستی کی سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ کام واقعی بڑے ثواب کا نظر آئے گا ــــ خود قرآن کریم میں، اسیروں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے کام کو بڑا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قرآن اس قسم کے نظر فریب سطحی جذبات سے بلند ہو کر حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس نے اس مقام پر کہا کہ اسطرح قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو ثواب کا کام سمجھنے والو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ۔ ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا، ایسا سنگین جرم تھا جس کی تلافی اس قسم کے خیرات کے کاموں سے نہیں ہو سکتی۔ تمہیں جو ضابطۂ ہدایت دیا گیا تھا اس میں دو احکام تھے ــــ ایک یہ کہ اپنے ہاں کبھی ایسی صورت پیدا نہ کرو کہ تم میں سے کمزور لوگوں کو دشمن اچک کر لے جائیں اور دوسرے یہ کہ جن کمزور و ناتواں لوگوں کو مستبد قوتیں قیدی بنا لیں انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیا کرو۔ یہ بڑائی کا کام ہے۔ تم نے پہلے حکم کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا بلکہ عمداً اس کی خلاف ورزی کی۔ اور دوسرے حکم کی تعمیل سے اپنے آپ کو بڑا نیکوکار سمجھنے لگ گئے۔ یہ روش غلط ہے۔ ضابطۂ خداوندی کو تھام لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب ہوگا۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ اس کے ایک حصہ پر ایمان رکھا جائے اور دوسرے حصہ سے انکار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں برآمد ہوگا کہ تمہیں پچاس فی صد نمبر مل جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) تم دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور قیامت کے دن بھی سخت ترین عذاب میں گرفتار۔

مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ نظام خداوندی کے اس حصہ کو جس سے مفاد پرستوں کی منفعت کوششوں پر زد پڑتی ہو پس پشت ڈال دیتی ہے اور ظواہر و رسوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ وہ عین دین بن جاتی ہیں۔ یہ ہے ان کی وہ ٹیکنیک جس سے وہ قوم کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ دین خداوندی پر عامل ہے۔

جس طرح سابقہ امتوں کے احبار و رہبان نے یہ چال چلی تھی۔ اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے ہاں بھی دین کی اصل و اساس کو پس پشت ڈال دیا گیا اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بڑھا چڑھا کر عین دین بنا دیا گیا۔ اب سارا زور ان جزئیات کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دین کی اصل و بنیاد کو سامنے نہ آنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کچھ روایات اور حکایات وضع کر لی جاتی ہیں جنہیں کبھی حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی سلف صالحین کی طرف۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

۱۔ قرآن کریم میں ہے:۔

دولت جمع کرنے کے خلاف

اے ایمان والو! یاد رکھو۔ ان علماء و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور اس طرح انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ) جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی منفعت کے لئے (فی سبیل اللہ) کھلا نہیں رکھتے، ان کے لئے الم انگیز عذاب ہے۔ جس دن چاندی سونے کے ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اب اس اکتناز کا مزہ چکھو۔ (۹/۳۴-۳۵)

ان آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہے (اور قرآن میں اس مضمون کی یہی دو آیات نہیں۔ اس قسم کی متعدد آیات ہیں) کہ اسلام ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں دولت جمع نہیں کی جا سکتی۔ اب دیکھئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے خلاف کیا کیا۔ اس نے ایک روایت وضع کی جو غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ روایت یہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب (مندرجہ بالا) آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ، رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوش مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

(ابو داؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ جلد اوّل۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۹)

آپ غور فرمائیے کہ اس ایک روایت نے کس طرح اسلام کے پورے کے پورے معاشی نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس روایت سے (جو ظاہر ہے کہ وضعی ہے) یہ ثابت ہوا کہ

۱۔ صحابہؓ سب کے سب سرمایہ دار تھے اور دولت جمع کرنا ان کا شعار تھا۔

۲۔ صحابہؓ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے۔ اس کا رسول اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے۔ لیکن وہ حکم ان پر گراں گزرتا ہے۔ وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے (معاذ اللہ) ان سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمائندہ، حضرت عمرؓ، رسول اللہ کے پاس جاتا ہے۔

۳۔ رسول اللہ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا کچھ خیال نہ کرو۔ تم جتنی جی چاہے دولت جمع کرتے جاؤ۔ بس اس میں سے اڑھائی فی صد زکوٰۃ نکال دیا کرو۔ باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اڑھائی فی صد زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن میں کہیں نہیں)

آپ دیکھیں گے کہ اس اڑھائی فی صد زکوٰۃ کی اہمیت اور افضلیت پر اس قدر زور دیا جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے متعلق (جس میں دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر تہدید آئی ہے) ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ٹیکنیک سے مسلمانوں کو کس طرح اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ دولت جمع کرنا کوئی جرم نہیں اور زکوٰۃ دے دینے سے سب مال پاک ہو جاتا ہے!

ایک مثال اور لیجئے۔ قرآن کریم کا نصب العین ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل تھا جس میں کوئی شخص کسی

عبوری دور کے احکام

دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ہر فرد کو اس کی ضروریاتِ زندگی، بطور بنیادی حق انسانیت ملتی رہیں۔ آغازِ اسلام کے وقت معاشرہ جس حالت میں تھا اس نے اپنے پروگرام کو وہاں سے شروع کر کے بتدریج اس کے منتہیٰ تک لے جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت معاشرہ میں طبقاتی تفاوت موجود تھا۔ کچھ لوگ امیر تھے، کچھ غریب اور محتاج۔ اس عبوری دور کے لئے قرآن نے دولت مندوں کو تلقین و تاکید کی کہ وہ صدقہ و خیرات سے محتاجوں کی مدد کریں۔ وراثت کے احکام بھی بنیادی طور پر اسی دور سے متعلق تھے۔ اس نظام کی آخری شکل یہ تھی جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضرورت کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب"۔ یہ نظام ایسا تھا جس میں ہر ایک کی ضروریات نظامِ مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں اور کسی کے پاس فالتو روپیہ رہتا ہی نہیں تھا۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے صدقہ خیرات فطرانہ کے لئے صبح و شام، دن رات، ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور قرآن کی وہ آیت جس میں حکم دیا گیا تھا کہ فالتو دولت کسی فرد کے پاس نہ رہنے پائے، کبھی سامنے نہیں لائی جاتی! جب اس پر زور دیجئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ آیت، زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو چکی ہے (بحوالہ روایت حضرت ابن عباسؓ)

صدقہ و خیرات کا نتیجہ

اور آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ صدقہ اور خیرات کا عملی مفہوم کیا ہے؟ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نظامِ معطلہ ایسا قائم کیا جائے جس میں ایک طبقہ ہمیشہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم، لہٰذا، دوسروں کا محتاج رہے۔ اور دوسرا طبقہ ایسا ہو جس کے پاس اپنی ضروریات سے زائد دولت ہو، یہ دوسرا طبقہ پہلے طبقہ کو خیرات دے کر ثواب کمائے۔ آپ سوچئے کہ اس دوسرے طبقہ کے پاس یہ فالتو روپیہ آیا کہاں سے ہے؟ باوجود تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ روپیہ انہی لوگوں کی محنت کی کمائی ہے، جو معاشرہ میں محتاج بن چکے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ان کی محنت کا پورا پورا ماحصل دے دیا جاتا تو نہ وہ محتاج ہوتے، نہ ان کے پاس فالتو روپیہ آتا۔ لیکن اس نظام نے کیا یہ کہ پہلے ایک طبقہ نے محنت کشوں کی کمائی کو غصب کیا اور اس طرح خود دولت مند بن گیا اور محنت کشوں کو محتاج بنا دیا۔ اور پھر ان محتاجوں کو خیرات کے چند ٹکڑے دے کر، جنت کا مالک بن بیٹھا۔ حالانکہ، قرآن کے الفاظ میں اُن لوگوں کو محتاج بنانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی تلافی صدقہ اور خیرات سے ہو ہی نہیں سکتی۔ خیرات دینے والے کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور لینے والے کے شرفِ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق۔

الصدقة تميت القلب

خیرات سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے

قرآن کریم نے عبوری دور کے لئے (اسلامی نظام کی تشکیل کے زمانے تک بہ تقاضائے حالات) اسے روا رکھا تھا۔ اور اس میں بھی دینے والوں سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس جذبہ کے تحت دیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکریہ کے خواہاں۔ اور اس کی تاکید کر دی تھی کہ وہ محتاج کی

مدد کے بعد سے احسان جتا کر اپنے صدقات کو باطل نہ بنا دیں لیکن موجودہ مذہب نے صدقہ و خیرات کو مستقل کارِ ثواب قرار دے کر قوم میں محتاجوں اور مفلسوں کے گروہ کی موجودگی کو مستقلاً ضروری قرار دے دیا۔ یعنی ایک ایسا نظام قائم کر دیا جس میں پہلے لوگوں کو مفلس اور محتاج بنایا جائے اور پھر انہیں خیرات دے کر ثواب دارین حاصل کیا جائے۔ کیا یہ وہی بنی اسرائیل کی روش نہیں جس سے وہ پہلے اپنے ہم نفسوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے اور پھر فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو بہت بڑی نیکی کا کام تصور کرتے تھے؟ یاد رکھئے! جس نظامِ معاشرہ میں محتاج اور مفلس مستقلاً موجود رہیں اس سے زیادہ انسانیت سوز نظام کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

واضح رہے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، کوئی بچہ مفلس اور غریب پیدا نہیں ہوتا۔ باطل معاشرہ کسی کو مفلس اور غریب بنا دیتا ہے، کسی کو دولت مند اور امیر۔ یہ تفریق، انسانی معاشرہ کی پیدا کردہ ہے خدا کی نہیں۔ خدا کی طرف سے برہمن۔ کشتری۔ ویش۔ شودر کی پیدائشی تفریق کا عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت بڑے فخر سے اعلان کرتی ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے مفلس اور غریب بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے امیر اور سرمایہ دار۔

ایک مثال اور سامنے لائیے۔ قرآنی نظریہ معیشت کی رُو سے جو شخص کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کو کلیتہً یا جزوّاً ہتیا کر لے جائے، وہ چور ہے، ڈاکو ہے، رہزن ہے، فریب کار ہے۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے

نظامِ ربوٰ جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب کر کے نہیں لے جا سکتا۔ اس کی بالکل ضد ایک اور نظامِ معیشت ہے جس میں ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا ہے۔ وہ اسے ربوٰ کے نظام سے تعبیر کرتا ہے۔ آجکل ہمارے ہاں اسلامی نظامِ معیشت اور سود کے متعلق بڑے زور شور سے بحثیں جاری ہیں لیکن چونکہ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ حرام، حلال ہوتا چلا آ رہا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح اسلامی ثابت کر دیا جائے اس لئے ہو یہ رہا ہے کہ۔ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ اگر اپنی مصلحتوں کے برعکس جائز و ناجائز کا معیار، قرآن کریم کو قرار دے لیا جاتا تو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ میں اس موضوع پر اس قدر کثرت سے لکھ چکا ہوں، اور لکھتا رہتا ہوں کہ اس وقت کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ قرآن نے اس سارے مسئلہ کو ایک بنیادی اصول کی رُو سے حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ اور نظامِ سرمایہ داری کی رُو سے معاوضہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ اسے ربوٰ کہا گیا ہے خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نظام اس قدر قرآنی نظام کی ضد اور اس کا دشمن ہے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۲/۲۷۹) انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم دے دو۔ آپ نے غور کیا کہ اسلامی نظام کی رُو سے ربوٰ کیسا سنگین ترین جرم ہے۔ یہ بغاوت کے مرادف ہے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کیا کیا۔ وہ ربوٰ کو جائز تو قرار نہیں دے سکتی تھی لیکن اس نے ربوٰ کی تعریف (DEFINITION) ایسی کر دی جس میں دوسروں کی محنت کا غصب کر کے لے جانا شیرِ مادر کی طرح حلال و طیب قرار پا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے تو اس اصل زر سے کچھ زیادہ وصول کرنا ربوٰ ہے۔ (اور اس جرم کے عواقب کے لئے بھی شرعی حیلے تراش لئے گئے) لیکن اگر کوئی شخص اسی روپے سے زمین کا ٹکڑا خرید کر اسے

کاشتکار کو دیدیتا ہے اور اس کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیدا کردہ فصل کا آدھا سمیٹ کر لے جاتا ہے، تو وہ ربوٰ نہیں مزارعت ہے۔ یا اس روپے کو کسی کاروباری کو دیدیتا ہے اور اس کے منافع میں شریک ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ربوٰ نہیں مضاربت ہے۔ یعنی ربوٰ کے لئے مختلف اصطلاحات استعمال کرنے سے حرام کو حلال قرار دیدیتے ہیں آجکل پاکستان میں یہ کاروبار بڑے زور شور سے چل رہا ہے اور اسے بلاسود بینکاری کہکر حلال و طیب قرار دیدیا جاتا ہے کاشتکار کی فصل یا کاروبار کرنے والوں کا منافع کہاں سے آتا ہے؟ یہ غریبوں کی محنت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے جب محنت کش یا صارفین غریب ہو جاتے ہیں، تو ان زمینداروں، کارخانہ داروں، اور اس قسم کے منافع خور سوداگروں سے اپیل کیجاتی ہے کہ ان غریبوں کو خدا واسطے کچھ دے کر، اپنا گھر جنت میں الاٹ کرالیں۔ یا حج کرکے اپنے سب گناہ بخشوا لیں۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ — ان محنت کشوں کی محنت کو غصب کرکے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جانا ایسا سنگین جرم تھا جسے خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا تھا۔ غلط نظام کی عدالت، چور، ڈاکو، رہزن کو مجرم قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرائے گی لیکن اس قسم کے رہزنوں، اور قزاقوں کو کسی جرم کا مرتکب قرار نہیں دے گی۔ علمائے کرام، روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والے کو جہنم کا کندہ بتائیں گے، لیکن ربوٰ کی ان دو سری شکلوں میں، سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنے والوں کو پکے اور سچے مومن قرار دیں گے — ہے ناں یہ تُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ کی بیّن مثال!

معاشرہ میں اس قسم کی صورتِ حالات کے پیدا ہونے کو روکنے کے لئے حضورؐ نبی اکرم نے وہ نسخہ تجویز فرمایا تھا جسے آپ نے تمثیلی انداز میں یوں بیان فرمایا تھا کہ

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصّے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصّے میں رہے جو نچلے حصّے میں تھے وہ پانی پینے کے لئے اوپر آگئے تو اوپر والوں سے انہیں یہ کہکر پانی پینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کرکے پانی لے لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر روک دیا جائے تو سب بچ جائینگے۔
>
> (ترمذی — باب الفتن)

اس مقام پر پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جو مملکت قرآن کی رو سے قائم ہوتی ہے، وہ تمام افراد معاشرہ کو رزق (سامانِ زیست) بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتی ہیں۔ اس عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں اور افراد کے پاس زائد از ضرورت دولت جمع نہ ہونے پائے۔ اس نظام میں ہر فرد کو رزق "خدا کی طرف سے ملتا ہے"۔ وہ ماشدۃ من السماء ہوتا ہے۔ اس میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔ سب آزاد، اور مساوی انسان ہوتے ہیں اور صرف خدا کے قوانین (کتاب اللہ) کے پابند جس مملکت میں یہ نظام نہ ہو وہ مملکت اسلامی نہیں ہوتی۔ سیکولر ہوتی ہے۔

دین کے نظام میں، نماز، روزہ، حج وغیرہ وہ ذرائع تھے جن سے دین کا مقصود حاصل ہوتا تھا۔ یعنی مساوات انسانیہ

اور احترامِ آدمیت کا مقصدِ عظیم۔ لیکن مذہب میں یہی چیزیں مقصود بالذات بن گئیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب زور نماز، روزہ

ظواہر پرستی

وغیرہ کی ظاہر اور رسمی ہیئت کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور اس مقصد کو سامنے لایا ہی نہیں جاتا جس کے حصول کا یہ ذریعہ تھے۔ اس کے برعکس، قرآن کو دیکھئے تو وہ سارا زور مقصد پر دیتا ہے۔ غور سے سنیئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی جانب کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر، اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کے لئے حیاتِ آخرت پر، ملائکہ پر، ضابطۂ خداوندی پر۔ اور ان انبیاء پر جن کی وساطت سے یہ ضوابطِ خداوندی دنیا کو ملے۔ ان امور پر ایمان لائے اور پھر مال کی محبت کے باوجود اسے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے جو اس کے قرب وجوار میں (یا رشتہ داروں میں) محتاج ہوں۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو، یا اُن میں کام کرنے کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جن کے پاس زادِ راہ نہ رہے، یا وہ جن کی کمائی اُن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں۔ انہیں آزاد کرانے کے لئے اپنی فاضلہ دولت کو وقف کر دیں۔ نیکی کی راہ ان لوگوں کی ہے ——— الخ (۲/۱۷۷)

اس مقام پر میں ایک ثانیہ کے لئے رُک کر، ایک اہم نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم

ایمان کی اہمیت

نے بتایا ہے کہ اصل نیکی کا کام یہ ہے کہ تم دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال کھلا رکھو۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اہم شرط بھی عائد کر دی ہے اور وہ یہ کہ تم دین کے ان اساسی عناصر پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے اور اس کے بغیر خود مال کا دینا بھی نیکی کا کام کیوں نہیں قرار پاتا۔ ایمان درحقیقت وہ آئیڈیالوجی، وہ نظریہ ہے جو زندگی کا صحیح تصور عطا اور اس کا نصب العین متعین کرتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ہی ہے جس کی بنیادوں پر اعمالِ انسانی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی کسی کام کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار بنتی ہے۔ اسی کے مطابق انسانی اعمال اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ انسانی عمل کا جذبۂ محرکہ ہی اُس کا ایمان (آئیڈیالوجی) ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صحیح اقدارِ حیات متعین کرتا ہے۔ اقدار (VALUES) نہ ہوں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب زندگی کو محض آب وگل کا کھیل سمجھا جائے اور موت کو اس کا انجام، تو انسانی زندگی، حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔ یہ صحیح آئیڈیالوجی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اشتراکیت جیسا معاشی نظام، جو سرمایہ داری کے مقابلہ میں کہیں انسانیت ساز ثابت ہو سکتا تھا، پروان نہیں چڑھ رہا نہ کبھی پروان چڑھ سکے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن، ایمان (آئیڈیالوجی یا صحیح نظریۂ حیات) کو اپنے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو اقتدار یا نظام، نظریۂ حیات یا اقدار کے بجائے اشخاص سے وابستہ ہو، اس کی عمر شخص متعلقہ کی عمر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نظریہ پر مبنی نظام، اشخاص کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اقدار قائم رہیں، وہ نظام بھی قائم رہتا ہے۔ یہی وہ عظیم اصولی حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لئے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ ——— (بقیہ)

مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۴) ۔ یعنی، اور تو اور، خود محمدؐ بھی بجز این نیست کہ اللہ کے ایک پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر آتے رہے اور اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے چلے جاتے رہے۔ تو کیا اگر کل کو یہ بھی قتل کر دیئے جائیں، یا وفات پا جائیں، تو تم یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام صرف ان کی ذات سے وابستہ تھا، پھر اپنے نظام کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ اور اس کی تشریح خلیفۂ رسول، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح فرمائی کہ جب رسول اللہؐ کی وفات پر امت میں کہرام مچ گیا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ اس بات کو غور سے سن لو کہ جس شخص نے محمدؐ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے۔ لیکن جو خدا کا عبد تھا اسے اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اس کا معبود حیؐ و قیوم ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اس اعلانِ عظیم نے دین کے نظام کو شخصیتوں سے بلند لے جا کر اقدار و نظریات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ نظام اس وقت بگڑا جب مسلمانوں نے قرآنی نظریۂ زندگی کو چھوڑ کر غیر قرآنی نظریات و تصورات کو اختیار کر لیا، اور سارا زور شخصیتوں پر دینے لگ گئے یا شخصیتیں سارا زور اپنے آپ کو منوانے پر صرف کرنے لگ گئیں۔

تیسری بات یہ کہ قرآنِ کریم نے آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا ارفع و اعلیٰ نظریہ پیش کیا تھا اور اس نظریہ کے مطابق حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی اُمت کی تشکیل فرمائی تھی جو رنگ، نسل، زبان، وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر ایک عالمگیر وحدت بن گئی تھی۔ اس باب میں، میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر وحدتِ اُمت اسی صورت میں وجود پذیر ہو سکتی ہے جب اُس آئیڈیالوجی کی نمود ہماری عملی زندگی میں ہو لیکن اگر ایسا نہ ہو اور آئیڈیالوجی محض الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے جسے رسمی طور پر دُہرا لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے وحدتِ اُمت کبھی ظہور میں نہیں آ سکتی، ایسا کرنے والے افراد کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ (بلکہ ایک ارب کے قریب) مسلمان بستے ہیں جو زبانی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک، رسول ایک، قبلہ ایک، کلمہ ایک ہے۔ اس اقرار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ سب مسلمان ——— نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر ——— ایک قوم کے افراد ہیں۔ لیکن عملاً ہماری صورت یہ ہے کہ ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان تو ایک طرف، ایک ملک کے مسلمان باشندے بھی ایک قوم کے افراد نہیں۔ اس خود فریبی کا سخت مضرت رساں پہلو یہ ہے کہ، ہم آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم تو بنتے نہیں، اور دنیا نے آئیڈیالوجی سے الگ ہٹ کر، تشکیلِ قومیت کے جو عناصر تجویز کئے ہیں، ——— مثلاً نسل، یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔ انہیں، نہ صرف یہ کہ ہم اپناتے نہیں بلکہ انہیں خلافِ اسلام قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، اسلام کو ہم اپنی عملی زندگی میں رائج نہیں کرتے اور کفر کو ہم اپناتے نہیں۔ یعنی ہم نہ آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک قوم بنتے ہیں (جو قرآن کا تقاضا تھا) اور نہ ہی باقی اقوامِ عالم کے معیاروں کے مطابق ایک قوم بنتے ہیں۔ یعنی ہم نہ تو اسلام کے انسانیت ساز نتائج سے متمتع ہوتے ہیں، نہ کفر کے دنیاوی مفاد سے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں، انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قومی اور اجتماعی نہیں۔ اس کا مشاہدہ آپ خود پاکستان میں کر سکتے ہیں۔ ہم اب تک قوم نہیں بن سکے، انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر

شخص کے سامنے اپنا اپنا انفرادی مفاد ہے۔ اجتماعی مفاد کسی کے پیشِ نظر نہیں۔ یہ ہوتا ہے حشر اُس قوم کا جو آئیڈیالوجی کے الفاظ کو دُہرا کر اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جائے کہ یہ اپنے نتائج عملاً مرتب کرے گی۔

اب پھر اُسی مقام کی طرف آئیے جہاں سے میں نے اس سلسلے کو چھوڑا تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ نیکی اور سعادت کی راہ، ارکانِ اسلامی کی رسمی پابندی نہیں۔ نیکی اور کشاد کی راہ اس کی جو دین کے مقصود و منتہیٰ پر نگاہ رکھے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے

"کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لیئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دے دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو خدا اور حیاتِ آخرت پر ایمان رکھے اور خدا کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرے۔ (تم اپنے خود تراشیدہ تصورِ مذہب کی رُو سے کچھ ہی سمجھو لو) میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (جو ایسا سمجھتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں) اور خدا کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ ظالمین پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی"

"یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین (آئیڈیالوجی) پر یقین محکم رکھتے ہیں اور نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اپنی جان اور مال سے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے، اسے بلا تأمل و توقف چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے مدارج معیارِ خداوندی کے مطابق بہت بلند ہیں اور یہی لوگ درحقیقت کامیاب و فائز المرام ہیں۔" ($\frac{9}{20-19}$)

یہی وہ نظام تھا جس میں، کوئی فردِ معاشرہ تو ایک طرف، (حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق) اگر کوئی کتا بھی

مساوات کے نمونے

بھوک سے مر جاتا تو معاشرہ کا سربراہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا تھا۔ اور یہی تھا وہ نظام جس میں مملکت کا سربراہ اُس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا مقصد مساواتِ انسانیہ تھا۔ آپ ہمارے واعظوں کو جھوم جھوم کر بیان کرتے دیکھیں گے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کا کوئی کپڑا کبھی تہ کر کے نہیں رکھا۔ اور حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے تھے تو دیکھا گیا کہ ان کے تہبند میں دس بارہ پیوند تھے۔ وہ ان واقعات کو بیان کر کے تاثر یہ دیں گے کہ یہ ان حضرات کی ذاتی اور انفرادی خوبیاں تھیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ یہ فطری نتیجہ تھا اس نظام کا جس کی بنیاد انسانی مساوات پہ تھی۔ وہ نظام جس میں تمام افرادِ معاشرہ کا معیارِ زیست ایک جیسا تھا جس میں جو ایک کو میسر آتا تھا وہی سب کو مہیا ہوتا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس مساوات کی تھوڑی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مساوات ایسی نہیں تھی

مساوات سے مقصود

جیسے جیل خانہ میں قیدیوں کو ایک جیسی وردی پہننے کو اور ایک جیسی روٹی کھانے کو ملتی ہے (ضمناً، اب تو جیل خانوں میں بھی یہ مساوات باقی نہیں رہی۔ ایک امیر آدمی، اور غریب آدمی، ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور عدالت سے انہیں ایک ہی جیسی سزا ملتی ہے لیکن جیل خانہ میں امیر آدمی کو اے کلاس دے دی جاتی ہے اور غریب آدمی کو سی کلاس۔ اور دیگر آسائشوں کے علاوہ

ہی سی کلاس قیدی، اس اسے کلاس والے کو بطور خدمت گار عطا کر دیا جاتا ہے۔ یعنی دونوں ایک جیسے مجرم ہیں لیکن ان میں سے وہاں بھی ایک آقا ہے اور دوسرا اس کا غلام) بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ مساوات انسانیہ سے مراد جیل خانہ کی سی مساوات نہیں اس سے مراد ایسی مساوات ہے جو ایک شریف گھرانے کے افراد میں ہوتی ہے۔ اس میں، گھر کی آمدنی میں سے ہر ایک فرد خاندان کو اس کی ضرورت کے بقدر ملتا ہے۔ ان میں فرق ضروریات کا ہوتا ہے۔ معیار زندگی کا نہیں۔ یہی کیفیت قرآنی نظام میں افراد معاشرہ کی ہوتی ہے۔ اس میں قوم کے سارے بچوں کو ابنائے ملت سمجھا جاتا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد، ہر ایک کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کر دی جاتی ہے۔ ہر فرد اس کام کو نہایت محنت اور دیانت سے سرانجام دیتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے اور نظام معاشرہ اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریات زندگی مہیا کئے چلا جاتا ہے۔ اس میں معیار زیست تو سب کا ایک ہوتا ہے، لیکن انفرادی ذوق اور پسند کا میدان وسیع ہوتا ہے — یعنی انسان اور انسان سب برابر (اس میں مرد اور عورت کی بھی کوئی تخصیص و تمیز نہیں) معاشرہ میں مدارج ہر ایک کے جوہر ذاتی، بلندی سیرت و کردار اور حسن کارکردگی کے مطابق۔ اور ضروریات زندگی کے مہیا کئے جانے میں انفرادی حسن ذوق کے مطابق انتخاب کی گنجائش۔ جوں جوں قومی دولت بڑھتی جائے، معاشرہ کا معیار زیست بلند ہوتا چلا جائے۔ یہ ہے نقشہ قرآنی نظام معاشرہ میں مساوات انسانیہ کا۔ یہی تھی وہ مساوات جس کے لئے اس نظام کے ارکان — صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ وغیرہ — کا تعین کیا گیا تھا۔ ہمارا واعظ اب بھی مساوات کا ذکر کرتا ہے، اور بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن اب اس مساوات کی صرف رسم باقی ہے۔ اس کی روح اور حقیقت غائب ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اذان کی آواز پر نماز میں:-

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ہماری مسجدوں میں "محمود و ایاز" ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ مساوات صرف مسجد کی صف تک محدود ہوتی ہے۔ مسجد سے باہر نکلتے ہی — بلکہ اس صف سے اٹھنے کے بعد، صحن مسجد میں ہی — محمود، محمود ہوتا ہے اور ایاز، ایاز — وہ محمود کے جوتے اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے، نہایت مؤدب انداز سے چلتا ہے۔ عرفات کے میدان میں بھی بے شک امیر اور غریب سب ایک ہی سلی چادر میں ملبوس کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہاں سے لوٹنے کے بعد، امیر حاجی جس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رات بسر کرتا ہے، غریب بچارا، اس کا تصور مرنے کے بعد کی جنت میں ہی کر سکتا ہے اس زندگی میں کبھی نہیں کر سکتا۔

ہمارا واعظ اب بھی بتاتا ہے کہ دیکھئے۔ روزہ میں غریب اور امیر ایک ہی طرح سارا دن بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔ یہ اسلامی مساوات ہے۔ لیکن وہ اس فرق کو کبھی سامنے نہیں لاتا جو ان دونوں کی سحری اور افطار میں ہوتا ہے۔ امیر کے بیٹے کی پہلی افطاری کے جشن میں جو کچھ ایک شام کو صرف ہو جاتا ہے وہ اس غریب کی سال بھر کی آمدنی سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

اس رسمی اور روایتی مساوات کا بھانڈا بالآخر، عیدگاہ میں جا کر پھوٹتا ہے۔ جس انداز سے عید کے چاند کا

انتظار ہوتا ہے اور جس ذوق و شوق اور جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے، اس سے یوں نظر آتا ہے گویا ساری قوم ہمہ تن جشنِ مسرت ہے۔ لیکن صبح جب عید کے اجتماع کے لئے جائیے، تو دور ہی سے یہ آوازیں فضا میں تھرتھری پیدا کرتی سنائی دیتی ہیں کہ "بابا! خدا کے نام پہ ——— چار پیسے دیتے جائیے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔" "میاں صاحب! اللہ کے واسطے میری جھولی میں کچھ ڈالتے جائیے۔ میں ایک لاوارث بیوہ ہوں جس کے بچوں کے تن پر سردی گرمی سے بچنے کے لئے کپڑا تک نہیں۔" دوسری طرف سے یہ دلگداز اور جگر خراش صدا و جانسوزاں روح ملتی ہے کہ "بابا! میں تین مہینے سے بیمار اور لاچار ہوں۔ میری دوائی کے لئے کچھ دیتے جائیے۔ خدا تمہاری نماز، روزے قبول کرے گا۔" یہ زہرہ گداز اور دل سوز آوازیں سنتے سنتے آپ عید گاہ میں داخل ہوں، تو وہاں اس سے بھی زیادہ جگر پاش منظر دکھائی دے گا۔ فاقہ کے مارے ہوئے زرد چہرے۔ افلاس و غربت کے جھنجھوڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے۔ افسردہ پیشانیاں۔ پژمردہ آنکھیں۔ پوری فضا پر عبرت انگیز مایوسیوں کی ہولناکی مسلط ——— اس سے پہلے، پھر بھی ایسا ہوتا تھا کہ ہر شخص کو بالعموم اور بچوں کو بالخصوص کم از کم سال میں ایک بار، عید کے موقعہ پر، نئے کپڑے ضرور مل جاتے تھے۔ اب آپ عید گاہ کے اجتماع پر نگاہ ڈالیے۔ شاید ایک فی صد نمازی بھی ایسے نظر نہ آئیں گے جو نئے کپڑوں میں ملبوس ہوں ——— باقی سب نے انہی پرانے کپڑوں کو دھو کر تن ڈھانپ رکھا ہو گا ——— اور ان میں بھی اکثر ایسے جن کے کپڑوں کے چیتھڑے اڑے ہوئے ہوں ——— ادھر چندہ مانگنے والے صفوں میں جھولیاں لئے پھر رہے ہیں۔ اُدھر امام صاحب صدقۂ فطر کے فضائل بیان فرما رہے ہیں ——— اس سے وہ سرمایہ داروں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور غریبوں اور محتاجوں کو تقدیر خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور اس طرح ان کی نگاہ کبھی اس باطل نظام کی طرف اٹھنے نہیں دیتے جس کی پیدا کردہ ناہمواریوں کا نام تقدیرِ خداوندی رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کا جشنِ عید، جسے جشن کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یاد رکھیئے! جس جشن میں قوم کا ایک فرد بھی حقیقی مسرت سے محروم رہ جائے، وہ جشن، جشن نہیں۔ قوم کی بد نصیبی کا ماتم ہے۔ عید اسی قوم کی ہے جسے رزق (حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ میں) خدا کے آسمانی نظام کی رو سے ملتا ہے اور جس میں ہر فردِ معاشرہ، بلا منتِ غیرے، بطورِ استحقاق، برابر کا شریک ہوتا ہے۔ جس قوم کو انسانوں کے خود ساختہ نظام کے تابع رزق ملے ——— جس کا نتیجہ یہ ہو کہ چند افراد تو قارون کے خزانے کے مالک ہوں اور باقی افرادِ معاشرہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے بھی ترس رہے ہوں۔ اور اگر انہیں وہ ٹکڑہ ملے بھی تو شرف و تکریمِ انسانیت بیچ کر ملے ——— اس قوم کی عید، ایک مقدس فریب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وہ عید ہے جس کا ہلال، اس قوم کی ہنسی اڑاتا ہے، اور دنیا کی قومیں جس کی فریب خوردگی کا تماشہ دیکھنے کے لئے دور دور سے آتی ہیں۔

اجتماعِ عید کا منظر

قرآن کریم نے روزوں کا مقصد یہ بتایا تھا کہ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (۲/۱۸۵)۔ "تاکہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ اس کے نظام کو انسانوں کے خود ساختہ ہر نظام پر غالب کر سکو۔ اقتدار صرف خدا (یعنی کتاب اللہ) کے لئے مخصوص ہو جائے اور اس میں کوئی انسان شریک نہ ہو۔ روزے سب سے پہلے ۲ھ ہجری میں فرض ہوئے اور جماعتِ مومنین نے ابھی سترہ دن کے روزے رکھے

تھے کہ انہوں نے بدر کے میدان میں لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا۔ یہ مطلب تھا تکبیر کا دین کے نظام میں۔ اب ہمارا امام یہ بتاتا ہے کہ نماز عید میں چھ زائد تکبیریں کہہ دینے سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے دیکھئے! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے ——— دین میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی تھے خدا کے اقتدار اعلیٰ کا اعلان۔ مذہب میں پہنچکر اس کا مفہوم نماز عید کی زائد چھ تکبیریں رہ گیا ——— مذہب میں چھ چھبیس، چھ سو مرتبہ بھی اللہ اکبر کہیئے تو اس کا، وہ لفظ دہرانے سے زیادہ نہ کوئی مفہوم ہوتا ہے، نہ کوئی نتیجہ۔ لیکن دین کے نظام میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا کے قانون سے بالا کوئی قانون نہیں اور آسمانی نظام سے برتر کوئی نظام نہیں۔ کائنات میں اقتدار اعلیٰ صرف خدائی نظام کو حاصل ہے۔ اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں اکبر و اصغر کی کوئی تفریق نہیں اس لئے کہ نہ کوئی کسی کا محتاج ہے نہ محکوم ——— سوچئے کہ اس تکبیر میں اور نماز عید کی موجودہ تکبیروں میں کس قدر فرق ہے اقبال کے الفاظ میں

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جشنِ عید شاہیں بچوں کا حق ہوتا ہے ——— مردار خور کرگسوں کا نہیں!

وَالسَّلام! ———

ایک غلطی کی تصحیح

ہمارے مروجہ طریق طباعت میں کسی کتاب کا غلطی سے میری چھپ جانا معجزہ سے کم نہیں۔ ہم اپنی طرف سے انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ (کم از کم) مطالب الفرقان میں غلطیاں نہ آنے پائیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہوا۔ احباب ان غلطیوں کی اطلاع بھی دیتے رہتے ہیں۔ ان کی تصحیح بہرحال ان کے آئندہ ایڈیشن میں ہو سکے گی لیکن ایک ایسی فاش غلطی ہمارے علم میں لائی گئی ہے جس کی فوری تصحیح ضروری سمجھی گئی ہے۔ مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۴۸۴ پر آیت اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ..... کا ترجمہ چھپا ہے "جو لوگ اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے"

لفظ انکار کی جگہ اقرار چاہیئے۔

نظامِ ربوبیت

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظام سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے، کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس:

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:۔

- مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔
- ماؤزے تنگ کا فلسفۂ اضداد کی بنیادیں کس طرح نااستوار ہیں۔
- ربوٰ (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔
- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب، اوفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔

ضخامت سوا چار سو صفحات۔ سنہری جلد۔ قیمت فی جلد پچاس روپے

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور — مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور

مرتبہ: محمد اسلام، نمائندہ بزم طلوع اسلام، کراچی

نگہ بازگشت

رہگزر طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل

قسط دوم

اس کی قسط اوّل طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکی ہے۔

جمہوری حکومت کے ایک وزیر کی حیثیت کس قدر قابلِ رحم ہوتی ہے اور اس کشمکش میں وہ عوام کی کس قدر خدمت کر پاتا ہے، اس کا جائزہ لیتے ہوئے طلوع اسلام نے لکھا:۔

"حکومت کی طرف آیئے تو وہاں اور ہی تماشا دکھائی دے گا۔ آپ (صوبائی یا مرکزی حکومت کے) کسی منسٹر کے

منسٹروں کی مصروفیتیں

ایک ماہ کے پروگرام کا تجزیہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے کتنا وقت صرف کرتا ہے اور اپنی کرسی کے محفوظ رکھنے کی دوڑ دھوپ کے لئے کتنا؟ آپ دیکھیں گے کہ اپنے فرائض پر توجہ دینے کے لئے اُسے دن بھر میں مشکل چند لمحات ملیں گے۔ باقی سارا وقت اسی ادھیڑ بن میں صرف ہو جائے گا کہ اس کی پارٹی کی منسٹری کسطرح قائم رہے اور اس میں اس کی اپنی پوزیشن کیسے مستحکم ہو! جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر ملک کے نظم و نسق کی جو حالت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے ..... اس کی وجہ بالکل واضح اور بیّن ہے۔ یعنی سیرت کی کمزوری، کیریکٹر کا فقدان۔ اور اس کا علاج؟ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم میں سے ہر ایک خاموش ہو جاتا ہے اور کسی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کہ ابھی دنیا میں کوئی ایسا انجکشن ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کے دل میں کیریکٹر داخل کر دیا جائے۔ کیریکٹر پیدا ہوتا ہے صحیح تعلیم اور مناسب تربیت سے اور تعلیم و تربیت کا انتظام آپ آنے والی نسل کے لئے تو کر سکتے ہیں، طفلانِ کہن سال کے لئے نہیں کر سکتے۔ ان کا علاج صرف قانون کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کشمکش کے ختم کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آئین میں اس قسم کی تبدیلی کر لیں جس سے وزیر اعظم (اور صوبے کے چیف منسٹروں) کا انتخاب براہ راست ہو۔ اور جو امیدوار منتخب ہوں وہ (صدر مملکت کی طرح) آئندہ انتخاب تک اپنی اپنی کرسی پر متمکن رہیں۔ انہیں وہاں سے ہٹانا ہو تو اس کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائے جو صدر مملکت کے لئے آئین میں رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی تجویز کریں گے کہ الیکشن میں جو ممبر کسی پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے اگر وہ پارٹی چھوڑ دے تو اسے رکنیت سے الگ کر دیا جائے۔" (اگست ۱۹۶۳ء)

جمہوریت کے طریق کار پر تنقید کرتے ہوئے طلوع اسلام نے مشورہ دیتے ہوئے لکھا:۔

"اس نظام کو اگر واقعی جمہوری نظام بنانا مقصود ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ حلقہ ہائے انتخاب

آمدنی کے اعتبار سے حلقہ ہائے انتخاب

آمدنی کے معیار کے مطابق متعین کئے جائیں مثلاً سو روپے ماہوار آمدنی والے افراد پر مشتمل ایک حلقہ۔ ان افراد کی تعداد کی نسبت سے اس میں نشستوں کا تعین، اور اس کے بعد شرط یہ کہ اس حلقے سے امیدوار وہی کھڑے ہو سکتے ہیں جن کی آمدنی اتنی ہو۔ اسی شکل کو آگے بڑھاتے جائیے۔ مثلاً پانچسو روپے ماہوار آمدنی والوں کا ایک حلقۂ انتخاب اور امیدوار بھی انہی میں سے۔ اسے اسی طرح بڑھاتے آپ لاکھوں روپے ماہوار آمدنی تک لے جائیے۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم اوپر اٹھتے جائیں گے نشستوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی اور آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے کا پورا ایوان، قوم کے صحیح نمائندگان پر مشتمل ہوگا۔ اس پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہیں گے کہ امیدواروں کے لئے کم سے کم تعلیم کی شرط بھی ضروری عائد ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے تعلیمی معیار بھی آمدنی کی نسبت سے رکھا جائے۔ سو روپے آمدنی والوں کے لئے پرائمری یا مڈل کی شرط بھی کافی ہے۔ جوں جوں اوپر اٹھتے جائیں تعلیمی معیار بھی بلند ہوتا جائے صدارت کے لئے البتہ معیار آمدنی نہیں صرف تعلیم رکھا جائے .....

اس طریق انتخاب کی رو سے (علاوہ اس کے کہ قوم کے نمائندے فی الواقعہ قوم کے نمائندے ہونگے) سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ الیکشن کی خرابیاں (جن کا ہم اس قدر رونا روتے رہتے ہیں) خود بخود دور ہو جائیں گی۔ سو روپے ماہوار آمدنی والا امیدوار اپنے ووٹر کو رشوت کہاں سے دیگا۔ اور جھوٹے سچے پروپیگنڈہ کے لئے رقم کہاں سے لائے گا؟ اور لاکھ روپے آمدنی والا اگر رشوت دینا چاہے گا تو اس کے ووٹر بھی اسی کی حیثیت کے ہوں گے۔ انہیں خریدنے کے لئے اسے خود بکنا پڑے گا۔

جہاں تک خصوصی مفادات کا تعلق ہے ان کے لئے ایک ایوان بالا (SENATE) کا ہونا ضروری ہے خصوصی مفادات سے ہماری مراد ہے مثلاً ڈاکٹر، وکلاء، جج صاحبان، اساتذہ، اہل قلم، سائنٹیفک تحقیقات کے ماہر۔ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ۔ ان کے لئے وہی انتخابی حلقے ہوں، وہی ووٹ دینے والے اور انہی میں سے امیدوار۔ ایوان زیریں اور ایوان بالا کے باہمی تعلقات اور دوائر اختیار کا فیصلہ آئینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔" (اکتوبر ۱۹۶۷ء)

مسئلہ تعلیم

قوم، انسانوں کے مجموعہ اور انبوہ کا نام نہیں ہوتا بلکہ یہ عبارت ہوتی ہے انسانوں کے اس مجموعہ سے جن میں یک دلی اور یک نگہی، ہم آہنگی و ہمخیالی ہو۔ یک نگہی اور یک دلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس قوم کی تعلیم مشترک ہو تاکہ اس کے افراد کے قلب و دماغ کی تعمیر ایک ہی نقشہ کے مطابق ہو اور ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں ایک ہی قالب میں ڈھل کر باہر نکلیں۔ تعمیر ملت کے سلسلہ میں، طلوع اسلام نے اس زمانے کے وزیر تعلیم کی توجہ سنت انبیاءؑ کی طرف مبذول کرتے ہوئے، اپنی دوسری اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۸ء میں لکھا:۔

..... تعمیر پاکستان میں سب سے مقدم سوال، تعلیم کا ہے۔ اگر ہماری تعلیم صحیح نہج و اسلوب پر

شروع ہو گئی تو سمجھ لیجئے کہ ہماری ملی عمارت کی بنیاد صحیح خطوط پر اُٹھے گی۔ اور اگر اس کی طرف سے ایسا ہی تساہل برتا گیا جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر برتا ہے تو انسانوں کا یہ "منتشر مجموعہ" تا قیامت، قوم نہیں بن سکے گا۔ ہم نے "منتشر مجموعہ" کی متضاد ترکیب دانستہ استعمال کی ہے۔ اس لئے کہ قرآن نے ایسے گروہ کے متعلق جو بظاہر اکٹھا نظر آئے لیکن جن کے دلوں میں اشتراک نہ ہو فرمایا ہے تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (۵۹/۱۴)۔ (تو انہیں "مجموعہ" خیال کرے گا حالانکہ وہ مجموعہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے قلوب ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں) اس کا نام "منتشر مجموعہ" ہے۔ قوموں میں وجۂ جامعیت قلبی ائتلاف ہوتا ہے نہ کہ بکریوں کا اجتماع۔ تعلیمی اشتراک کے بغیر قلبی اشتراک ناممکن ہے۔"

اس مسئلہ کی اہمیت

اس مسئلہ کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے طلوع اسلام نے، جنوری ۱۹۵۲ء میں لکھا:۔

کچھ ہوش میں آنے کی مری شکل بھی ناصح
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

ہوش میں آنے کی شکل، نہ تو اسمبلیوں میں پیدا ہو سکے گی نہ وزارتوں کے کابینوں سے، نہ یہ مُلّا کے حجروں سے اُبھرے گی نہ شیخِ طریقت کی خانقاہوں سے۔ اس کی ابتدا درس گاہوں سے ہو گی۔ قرآن نے اس کی شکل یہی بتائی ہے۔ جب اس نے کہا کہ نظامِ ربوبیت کے قیام کی صورت یہ ہے بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)۔ ضابطۂ قانونِ خداوندی کو سمجھنا اور سمجھانا اور اُسے اس قدر دُہرانا کہ یہ دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور آج اسے پھر دُہراتے ہیں کہ جو لوگ اس طریقِ کار کی اہمیت کو پہچانتے ہیں وہ کچھ وقت کے لئے تصور کر لیں کہ ابھی ہم پہلے دور ہی میں ہیں۔ وہ سربستہ بن کر اٹھیں اور ملک میں دو چار ایسی درسگاہیں قائم کر دیں جن میں قرآن کی تعلیم دی جائے۔ مُلّا کے قرآن کی نہیں، خدا کے قرآن کی جو انسان کو تسخیرِ ارض و سماوات کے راز ہی نہیں بتاتا بلکہ اس پر اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے نکل جانے کی راہیں بھی کشادہ کر دیتا ہے۔ ان متحجر انسانوں کو چھوڑ دو کہ جنہوں نے جو کچھ بننا تھا بن چکے۔ اپنی تمام توجہات مرکوز کر دو ان سیال قلوب پر (یعنی آنیوالی نسلوں پر) جنہیں، تم جس قالب میں ڈھالنا چاہو، ڈھال سکتے ہو۔ اس سرزمین کی حفاظت کا انتظام رکھو اور اس متاعِ عظیم کے امین تیار کرنے کے لئے درس گاہیں تیار کرو۔۔۔۔۔۔ دس پندرہ برس تک نہایت خاموشی سے ان درس گاہوں کو مصروفِ تعلیم و تربیت رہنے دو۔ اس کے بعد دیکھو کہ ان میں کس قسم کے شہباز نکلتے ہیں۔ اس قسم کے شہباز کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا

سیاستدانوں کے ہنگامے انہی کے حوالے کر دو، بزنس والوں کو چوربازاری کی بھول بھلیوں میں اُلجھا رہنے دو، مُلّا کو قوم کی عاقبت سنوار کر اپنی روٹی کمانے کے دھندے میں لگا رہنے دو۔ یہ سب میدان ان کے لئے چھوڑ دو اور تم قوم کے بچوں کو سنبھال لو۔

تم دیکھو گے کہ آخرالامر سب کی مساعی کا بیسد ثابت ہو گی۔ ان کے کاروبار میں نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو گا۔ ان کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ لیکن جس تخمِ صالح کی آبیاری کرو گے وہ ایک دن ایسا تناور درخت

بن جائے گا جس کی شاخیں فضائے عالم میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں گی۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) قوم وہی زندہ رہ سکتی ہے جو مفادِ عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر مستقبل کی خوشگواریوں کو ترجیح دے۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۝ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

صبرِ طلبیٔ عشق

آپ کی بے علمی آپ کو یہ کہہ کر فریب دے گی کہ دنیا برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ قوموں کی تقدیریں صبح شام بدل رہی ہیں۔ بین الاقوامی حالات قدم قدم پر پلٹیاں لیتے رہتے ہیں۔ مزاجِ روزگار اتنی سرعت سے بدل رہا ہے اور ہمیں ایک ایسا پروگرام بتایا جا رہا ہے جس میں دس پندرہ سال منتظر رہنے میں گزر جاتے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو چالیس دن تک پلاسٹر میں رکھنا ہی ہوگا خواہ اتنی دیر میں قافلہ کتنا ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائے۔ تپ دق کا علاج کبھی ایک رات میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں تک سینی ٹوریم میں رہنا پڑتا ہے۔ آپ اس پروگرام کو یہ کہہ کر ٹال دیجئے کہ "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک"۔ اگر آپ نے اس پروگرام کو تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد شروع کر دیا ہوتا تو اس وقت تک اس کی تہائی منزل ختم ہو چکی ہوتی۔ اگر آپ اسے اب بھی شروع کر دیں تو ہر گزرنے والا دن آپکے عرصۂ انتظار میں کمی کرتا جائے گا۔ تیزی سے بڑھنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے جو کچھ اور لوگ کرنا چاہیں انہیں کرنے دیجئے۔ لیکن آپ اس سست گام طریقِ کار کو اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ اس کے نتائج بہت درخشندہ اور پائیدار ہوں گے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ شَهِيْدٌ"

خالی قانون سے کچھ نہیں ہو سکتا

صحیح معاشرہ کی تخلیق صرف قانون بنانے سے نہیں، ذہنی تبدیلی سے ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے لکھا:

"یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپ سے جو یہ کہا گیا ہے کہ اگر پاکستان میں "آئینِ شریعت" کا نفاذ ہو گیا تو عوام کی حالت ایک دن میں سنور جائے گی۔ یہ بھی فریب ہے اور محض آپ کے ووٹ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ۔ اوّل تو جس قسم کا "آئینِ شریعت" ان لوگوں کے ذہن میں ہے اس میں عوام کی حالت نہ کبھی سُدھری تھی نہ سُدھر سکتی ہے۔ وہ آئین مفاد پرستی اور سرمایہ داری کا محافظ ہے جس میں عوام کو ہمیشہ لوٹا کھسوٹا گیا ہے۔ اس آئین میں بھی دنیا کی خوشگواریاں مفاد پرست طبقہ کے حصے میں آئیں گی اور آپ کو "آخرت میں جنت" ملنے کی تھپکیاں دے کر سُلا دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قوموں کی حالت خالی قوانین کے زور پر نہیں بدلا کرتی۔ اس کے لئے ذہنی تبدیلی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہنی تبدیلی صرف قرآنی فکر سے پیدا ہو سکتی ہے اور یہی وہ تبدیلی ہے جس سے صحیح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قانون کا کام معاشرہ کے مستثنیات (EXCEPTIONS) یعنی جرائم پسند طبائع کی روک تھام ہوتا ہے، نہ کہ صحیح معاشرہ کی تخلیق۔"

تعلیم کے معاملہ میں ثنویت ختم کیجئے

اسی امر کی تجدید طلوعِ اسلام نے جنوری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں کی تھی۔

"اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی روح کے مطابق اسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں

کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب وہ مانغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے۔ وہ قرآنی نظام کی معلمیت و اصلحیت کے علیٰ وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رُو سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوع انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہو گی..... ایسی قوم کے ہنگامی مفاسد کی روک تھام تو ہنگامی احکام و تدابیر سے ہو سکتی ہے، ان کا مستقل علاج اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہو گی۔ اور اس کے بنیادی خطوط وہ ہوں گے جنہیں قرآن کریم نے تجویز کیا ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم" کی اس ثنویت کو ختم کیا جائے۔ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درس گاہوں میں کیوں دی جائے۔ ہمارے ہاں ایک ہی درس گاہ میں عصر حاضر کے جملہ علوم کے ساتھ دین کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ اور اس طرح مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے ادارہ اور (INSTITUTION) کو ختم کر دینا چاہیئے۔"

دینی تعلیم کو غیر اسلامی تصوّرات سے پاک کیا جائے۔ اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے طلوع اسلام نے اپنی جنوری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں لکھا:۔

اسلام کو غیر اسلامی تصوّرات سے پاک کرو

"حقیقت یہ ہے کہ وہی افراد، ادارہ یا مملکت مسلمانوں کی حقیقی بہی خواہ اور نوع انسانی کی محسن ہو گی جو اسلام کو غیر اسلامی تصوّرات و نظریات کی زنجیروں سے آزاد کر کے اسے اپنی منزل تک پہنچنے کا موقع مہیا کرے گی۔ لیکن یہ کام اس کے ہاتھوں سرانجام پائے گا جو تعصب اور جہالت کی ہر یورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہو..... اسلام کو ان غیر اسلامی زنجیروں سے آزاد کرانا کسی محکوم ملک کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے سے بھی زیادہ مشکل اور ہمت طلب مرحلہ ہے۔ لیکن اس کے بغیر ملک میں کوئی صحیح اور پائیدار تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

مدارس کی کمی اور اس کے حصول کی دشواریوں کا حل پیش کرتے ہوئے طلوع اسلام نے جولائی ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں حکومت کو مشورہ دیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ:۔

مساجد سے مدارس کا کام لیجئے

"اقوام عالم میں اگر ہم باشعور قوم کہلانے کے مدعی ہیں تو یہ ضروری ہے کہ اپنی زندگی کے اُن مسائل کو دیانتداری سے حل کریں اور مسجدوں سے تربیت گاہوں کا کام لے کر اس کمی کو پورا کریں جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل تباہ ہو رہی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اوّل تو مدرسے بہت کم ہیں اور اس کی بنیادی وجہ عمارات کا نہ ہونا ہے۔ دوسرے ان مدرسوں میں دور دور سے بچے آتے ہیں جن کی ٹرانسپورٹ کا کوئی تسلی بخش انتظام نہیں..... اس کے برعکس مسجد قریب قریب ہر محلہ میں موجود ہوتی ہے پھر اس کا فاصلہ بھی ہر گھر سے دس بیس قدم سے

زیادہ نہیں ہوتا۔ صبح کی نماز کے بعد ظہر کے وقت تک (کہ یہی عام طور پر بچوں کے اسکول کا وقت ہوتا ہے) وہ بالکل خالی پڑی رہتی ہیں۔ محلے کے بچے کتنی آسانی سے اس میں تعلیم پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مساجد کے امام، خطیب اور مؤذن جو خطبۂ جمعہ اور نمازوں کے علاوہ باقی اوقات میں بے کار رہتے ہیں بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک پیسہ خرچ کئے بغیر نئی نسل کے لاکھوں بے کار بچے جنہیں سکولوں میں داخلہ نہیں ملتا، تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ ہو جائیں گے۔ اور تباہی کے جس سیلاب میں ان کی زندگیاں بہے چلی جا رہی ہیں اس سے بچا کر انہیں صحیح راستے پر ڈالا جا سکتا ہے۔ ہم ارباب حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کریں۔"

معاشی مسائل اور ان کا حل

قرآنی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے، قرآنی مملکت جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے وہ افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ نحن نرزقکم و ایاھم (۶/۱۵۱)۔ (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ طلوعِ اسلام نے شروع ہی سے قرآن کے عطا فرمودہ اس انسانی حق کو حکومتِ پاکستان سے منوانے کے لئے جدوجہد کی ہے۔ مذہبی پیشواؤں کی بدحالی کی طرف توجہ دیتے ہوئے اس نے حکومت سے اپیل کی اور طلوعِ اسلام کی جنوری ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"یہ مصیبت پاکستان میں ابھی سے نازک صورتِ حال اختیار کر چکی ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت، ہندوستانی مسلمان جوق در جوق پاکستان کی طرف آنے شروع ہوئے ان میں مختلف پیشوں کے لوگ تھے جنہوں نے یہاں پہنچکر اپنے اپنے پیشے اختیار کر لئے۔ لیکن مذہبی پیشواؤں (مساجد کے ائمہ، مذہبی مدرسوں کے اساتذہ، قاضی، مفتی وغیرہ) جو یہاں پہنچے تو ان کے لئے یہاں جگہ ہی نہ تھی۔ مساجد سب پُر تھیں۔ ہندو اور سکھ جو اپنی عبادت گاہیں خالی کر گئے تھے وہ انہیں الاٹ نہیں کی جا سکتی تھیں، کام انہیں کوئی آتا نہیں تھا۔ اب سوچئے کہ بیکاروں کا اتنا بڑا طبقہ جس نے وہاں ایسی زندگی بسر کی تھی لوگ دیتے بھی تھے اور ہاتھ بھی چومتے تھے، وہ یہاں کسطرح گزر اوقات کرتا؟ پاکستان کے لئے یہ مسئلہ بڑا غور طلب تھا۔ چنانچہ ہم نے اسی زمانے میں ارباب حل و عقد کی توجہ اس طرف منعطف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر اس طبقہ کی معاش کا بندوبست نہ کیا گیا تو یہ قسم قسم کے فتنوں کا موجب بن جائے گا۔ افسوس ہے کہ اربابِ اقتدار نے اس طرف توجہ نہ دی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ملک ابتری اور پریشانی کی آماجگاہ بنا دیا گیا۔ اس مصیبت کا اب بھی یہ حل ہے کہ اس طبقہ کے جو لوگ اسوقت ملک میں بیکار ہیں، انکی معاش کا انتظام کیا جائے اور آئندہ

مذہبی پیشواؤں کی معاش کا انتظام

کے لئے یہاں مذہبی مدرسے بالکل نہ کھلنے دیئے جائیں تاکہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔ باقی رہی دینی تعلیم، سو اس کا انتظام عام اسکولوں اور کالجوں میں کیا جائے۔ اگر قوم نے اب بھی اس طرف توجہ نہ دی تو یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو انڈونیشیا ایران اور مصر وغیرہ میں ہو رہا ہے۔"

مملکت کے باشندوں کے لئے فراہمیٔ رزق کی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے طلوع اسلام نے اپنی فروری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں مشورہ دیتے ہوئے لکھا:۔

معاشی نظام "ہم اس مقام پر دہرا دیں کہ قرآنی نظام ربوبیت کے مطابق تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔ ان پر ملکیت نہ افراد کی ہوتی ہے نہ مملکت کی۔ "ذرائع پیداوار" میں صرف زمین ہی شامل نہیں۔ دور حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب حکومت کارخانوں کے نظام کے متعلق بھی اس قسم کی اصلاحات پر توجہ دے گی کیونکہ جو خرابیاں زمین سے حاصل شدہ لامحدود دولت سے پیدا ہوتی ہیں، اسی قسم کی خرابیاں کارخانوں سے حاصل کردہ لامحدود دولت سے بھی رونما ہوتی ہیں۔ قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاضلہ دولت (ضرورت سے زیادہ دولت) کو کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔ اسے قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسان کی منفعت کے لئے عام کر دیا جائے۔ خدا کرے ہماری مملکت بتدریج اس منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح ایک ایسے انسانیت ساز معاشی نظام کو متشکل کر دکھائے جس کے سامنے امریکہ اور روس دونوں کی نگاہیں جھک جائیں۔"

کمیونزم کی روک تھام کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے نشاندہی کرتے ہوئے جنوری ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"کمیونزم کی روک تھام صرف اسی صورت میں ہو سکے گی جب قرآنی نظام ربوبیت یہاں عملاً نافذ ہو جائے

کمیونزم کی روک تھام کے لئے قرآن کا معاشی نظام اس نظام کی رُو سے مملکت اس بات کا ذمہ لیتی ہے۔ کہ وہ افراد مملکت کو بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے گی۔ لہٰذا سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہمارے آئندہ دستور میں یہ بنیادی شق شامل کی جائے کہ افراد مملکت (اور ان کی اولاد) کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوگی اور اس کے بعد عملاً ایسی تدابیر رفتہ رفتہ اختیار کی جائیں جن سے مملکت اپنی اس اہم بنیادی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔ یہی وہ بند ہے جس سے کمیونزم کا سیلاب رُک سکتا ہے۔ نہ صرف کمیونزم کا سیلاب رُک سکتا ہے بلکہ یہ پاکستان کو اقوام عالم کی امامت (لیڈر شپ) کا مستحق بنا سکتا ہے۔"

طلوع اسلام نے مارچ ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں مغربی اقوام کی تقلید کی تباہ کاریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا:۔

"..... ہمارے پاس قرآن کا عطا کردہ ایسا معاشی نظام ہے جو ایک طرف نظام سرمایہ داری کی خون

آشتی کا ازالہ کر دیتا ہے اور دوسری طرف کمیونزم کی انسانیت سوز تباہیوں سے بچا لیتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے اپنے آئین کو قرآنی پیکروں میں ڈھالنے کے بجائے اُسے مغربی اقوام کے نقوش پر چلایا، یا اس آئین میں مفاہمتوں (COMPROMISES) سے کام لینا چاہا تو مغربی اقوام تو شاید (اپنی سائنٹیفک ترقیوں کے بل بوتے پر) کچھ دن اور جی لیں، لیکن ہماری تباہی کسی کے روکے نہیں رُک سکے گی۔"

حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کی اہم ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوع اسلام نے مشورہ دیا اور قوم کا صحیح تعاون حاصل کرنے کے طریق متعین کرتے ہوئے ستمبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں لکھا:۔

قوم کو سوچنا سکھائیے

"ہماری قوم جذبات پرستیوں سے کافی پٹ چکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ انہیں حقائق کا سامنا کرنے کا عادی بنایا جائے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو مسئلہ پیش نظر ہو اسے نہایت وضاحت سے قوم کے سامنے رکھا جائے۔ اسے اس کے مفید اور مضر پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیا جائے۔ پھر یہ سمجھایا جائے کہ پاکستان کے دشمنوں کی کیا چال ہے، ان کی تدبیریں کیا ہیں، ہم نے ان کا حل کیا سوچا ہے۔ اس کے بعد قوم سے کہا جائے کہ وہ اس مسئلہ پر غور کرے۔ اسے سوچے سمجھے اور پھر بتائے کہ اس باب میں اس کا کیا مشورہ ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے آپ قوم کا صحیح تعاون حاصل کر سکتے ہیں اور ان خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن سے آئے دن مملکت پاکستان دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کی جذباتی اور مبہم تقریروں سے قوم اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ یا تو ان مسائل کو آپ خود بھی اچھی طرح سے نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو آپ نے ان کے حل کے لئے کوئی مؤثر قدم نہیں اُٹھایا! اس لئے اپنی بے عملی کو جذبات پرستی کے نقاب میں چھپا رہے ہیں۔ یہ صورت حال کسی طرح بھی خوش آیند نہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ ایک وقتی گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی گرمجوشی شراب کے نشے کی طرح ہوتی ہے جس کا خمار بعد اضمحلال اور افسردگی پیدا کرتا ہے وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ اس کے اضمحلال کا نقصان اس کی گرمجوشی کے فائدہ سے کہیں زیادہ ہے۔"

حکومت اور عوام

حکومت اور عوام کے رابطہ کے اصل مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے طلوع اسلام نے اپنی اپریل ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

"ہم حکومت سے پھر گذارش کریں گے کہ وہ اپنے آپ کو جمہور کی آواز بنائے۔ ملت کو یقین دلائے کہ حکومت ملت کی ہے اور خود اس کا ثبوت دے کہ وہ ملت کو اپنی ملت سمجھتی ہے۔ موجودہ طریقے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے نہیں۔۔۔۔ اب حقائق سے کھیلنے یا چشم پوشی کا وقت نہیں۔ پاکستان ایک حقیقت ہے۔ وہ نہ افسانہ ہے نہ شعر۔ زندگی بجائے خود نہ افسانہ ہے نہ شعر۔ ہم میدانِ جنگ میں ہیں۔ زندگی سعیٔ پیہم ہے اور جہادِ مسلسل شاعری زندگی کے حقائق سے گریز کا نام ہے۔"

(طلوع اسلام۔ اپریل ۱۹۴۸ء)

طلوع اسلام نے اپنی دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں خلفاء راشدینؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کی تنبیہہ کرتے

ہوئے ارباب حل وعقد کو یاد دلایا:

" جب تک ہمارے ارباب حل وعقد حضرت عمرؓ کی طرح راتوں کو بھیس بدل کر اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھیں گے کہ قوم کی حالت کیا ہے اور اپنے کانوں سے نہیں سنیں گے کہ — کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا — اور جب تک قوم کا ہر فرد (عہدِ فاروقیؓ) کی اس بڑھیا جیسی جرأت اپنے اندر نہیں رکھے گا کہ وہ ارباب حل وعقد کو بتا سکے کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔ اس وقت تک یہ مصاحبین، اربابِ اقتدار کو برابر فریب میں مبتلا رکھیں گے اور ارباب اقتدار دیکھتے بوجھتے برابر فریب کھاتے چلے جائیں گے اس لئے کہ فریب میں بڑی لذت ہوتی ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کے لئے بڑے کیرکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔"

عوام کو مشورہ دیتے ہوئے طلوع اسلام نے اپنی جنوری ۱۹۴۹ء کے شمارہ میں لکھا:

عوام کو مشورہ — قانون شکنی چھوڑ دو

" وہ حکومت ختم ہو گئی جس کے خلاف تمہیں قانون شکنی اور عدولِ حکمی کے لئے بھڑکایا جاتا تھا۔ اب اس کی جگہ تمہاری اپنی حکومت آ گئی لیکن تم نے اس قانون شکنی اور ضابطہ فراموشی کی روش کو اصلِ حیات اور حکم عدولی اور نافرمانی کے مسالک کو عین آزادی سمجھ رکھا ہے اور اب تک تمہاری حالت یہ ہے کہ ذرا کوئی بات خلافِ منشاء ہوئی اور تم نعل برآتش ہو گئے۔ ذرا سوچو کہ اس طرح دنیا میں کوئی نظم قائم اور کوئی حکومت مستحکم ہو سکتی ہے؟ ...... اگر قانون غلط ہے تو اسے صحیح قانون سے بدلنے کی کوشش کرو لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر بے آئینی کا انتشار نہ پیدا ہونے دو کہ اس انتشار سے دشمن، جو تمہاری گھات میں بیٹھا ہے، فائدہ اٹھائے گا اور تمہاری یہ حالت ہو جائیگی جیسے ایک نوزائیدہ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے نیچے گر جائے۔"

قانون کی فرمانروائی

قانون پر عملدرآمد کرانے کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے حکومت کو مشورہ دیا کہ جرأت اور بیباکی سے چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر کا امتیاز کئے بغیر آنکھوں پہ پٹی باندھ کر ترازوئے عدل ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے۔ اس نے اپنی ستمبر ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں لکھا:

" ضرورت ہے دیانت مقصد کے ساتھ اس مسئلہ کو ہاتھ میں لینے کی، اس کے لئے ضرورت ہے عزمِ راسخ اور ہمت بلند کی، ضرورت ہے جرأت اور بیباکی کی، ضرورت ہے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ترازوئے عدل کو ہاتھ میں لینے کی، اور ضرورت ہے چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر کا امتیاز کئے بغیر بطشِ شدید اور گرفتِ محکم کی۔ اسی سے ایسی فضا پیدا ہو سکتی ہے جس سے قانون شکنی کرنے والے کا دل تنہائی میں خوف سے کانپ اٹھے اور پرامن شریف انسان اطمینان کی نیند سو سکیں۔ جو حکومت ایسی فضا پیدا کر دے وہی کامیاب اور قابلِ فخر حکومت کہلا سکتی ہے۔"

طلوع اسلام نے جولائی ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں پاکستان کا دیگر ممالک سے موازنہ کرتے ہوئے حالات کا تجزیہ کیا اور حکومت کی توجہ ان حقائق کی جانب ...... مبذول کراتے ہوئے لکھا:

۱۔ " پاکستان پر ۱۹۶۵ء کے بھارتی حملہ اور حال ہی میں مصر پر اسرائیلی حملہ نے یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ اب کسی ملک پر مخالف ملک کی طرف سے بلا اطلاع اور الٹی میٹم کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ بنا بریں

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہر وقت جنگ کی حالت میں سمجھیں۔

ہم اور چین اور اسرائیل

۲۔ قریب بیس سال کا عرصہ ہوا، پاکستان۔ اسرائیل اور چین ایک ہی وقت میں منصۂ شہود پہ آئے۔ اس عرصہ کو ان تینوں ملکوں نے کسطرح استعمال کیا اس کا اندازہ ان کی موجودہ حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسرائیل کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ یہودی دنیا کی متمول ترین قوم ہے اس لئے ہم دولت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن چین تو دنیا کا غریب ترین ملک تھا۔ اس نے جو کچھ کیا اس کا بنیادی راز اس کے معاشی نظام کی تبدیلی میں ہے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ وہ نظام خود قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ اس لئے اس کے اختیار کرنے سے ہم (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) قرنِ اوّل کے صحیح اسلام کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہمارے زندہ رہنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ ہم امریکہ اور یورپ کے سرمایہ دار نظام کا مقابلہ سرمایہ داری نظام سے کر ہی نہیں سکتے۔

۳۔ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے ہیں۔ ہماری ساری توجہ اسی طرف مرکوز ہو جانی چاہیئے۔

قرآن کا عسکری نظام

۴۔ قرآن کا عسکری نظام یہ تھا کہ ملت کا ہر فرد سپاہی ہو، اسرائیل اور چین دونوں نے اپنے ہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ملٹری ٹریننگ لازمی قرار دے دی اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اگر ہم نے اس میں مزید تغافل برتا تو اس نقصان کی تلافی کبھی نہیں ہو سکے گی۔

ذرائع ابلاغ کا صحیح استعمال

۵۔ ہماری قوم بے حد جذباتی واقعہ ہوئی ہے۔ اس کا خوشگوار پہلو تو یہ ہے کہ خطرہ کے وقت یہ بڑی سرگرم عمل ہو جاتی ہے لیکن اس کا نقصان رساں گوشہ یہ ہے کہ یہ دوسروں کے پراپیگنڈہ کا بھی اسی تیزی سے شکار ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ قوم میں صحیح سیاسی شعور پیدا کیا جائے۔ عوام میں اس کا ذریعہ پریس ہے اور طلبا میں صحیح نظام تعلیم۔ اور ہم نے ان بیس سال میں ان دونوں ذرائع تربیت سے مجرمانہ تغافل برتا ہے۔ اگر ان کی طرف فوری توجہ نہ کی گئی تو پھر ہمارے پنپنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔

ہماری آئیڈیالوجی

۶۔ اسرائیل نے ایک مقصد کے حصول کے لئے مملکت قائم کی۔ چین کے پیش نظر اپنی مخصوص آئیڈیالوجی تھی۔ بیس برس میں ان کا ہر قدم اسی مقصد اور منزل کی طرف اٹھتا چلا گیا اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے بھی ایک آئیڈیالوجی کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا لیکن اسکے بعد وہ آئیڈیالوجی ہماری زبانوں تک رہ گئی۔ جب تک اس آئیڈیالوجی کو مقصودِ مملکت قرار نہیں دیا جائے گا، ہم میں مقصد کی خاطر زندہ رہنے اور مقصد کی خاطر مر مٹنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہ آئیڈیالوجی قرآن میں بیان کردہ مستقل اقدار کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک پوری کی پوری قوم میں (اوپر کے طبقہ سمیت) اس مقصد کے لئے "جنون" پیدا نہیں ہو جاتا ہم زندہ رہنے کے مستحق قرار نہیں پا سکتے۔

۷۔ ہم نے دین کے اشتراک کی بناء پر ایک قوم ہونے کا دعویٰ کیا اور اسی دعوےٰ کی بنیادوں پر پاکستان حاصل کیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم ابھی تک ایک قوم بن ہی نہیں سکے۔ ہم تنہا افراد کی زندگی بسر کر رہے ہیں یا پارٹی

ہم ایک قوم نہیں بن سکے

اور علاقائی نسبتوں سے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملک کا اجتماعی مفاد ہمارے سامنے ہی نہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے مفاد کی دھن میں مصروف اور لوٹ میں مشغول ہے۔ یہ اوپر کے طبقہ کا حال ہے۔ باقی رہے عوام سو وہ روٹی کی فکر میں اس قدر پریشان و سرگرداں ہیں کہ انہیں یہ کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ملک کیا ہوتا ہے اور قوم کسے کہتے ہیں۔ جب تک ریت کے ان بکھرے ہوئے ذرّوں کو محکم بنیاد پر چٹان نہیں بنایا جائے گا، یہ کسی طوفانِ بلا کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

۸۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ لیڈر رطب اللسان ہیں کہ قوم نکمی ہے۔ اور قوم شاکی ہے کہ لیڈر

سیلاب سے سب تباہ ہو جاتے ہیں

کام کے نہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ (۸/۲۵) اس تباہی سے ڈرو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جو ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ وہ ساری کی ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے پھر نہ قوم کے ظالم بچا کرتے ہیں نہ مظلوم۔

۹۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہر قوم کو مہلت کا وقفہ ملتا ہے اور اس کے ختم ہونے سے پہلے اسے ایک وارننگ ملتی ہے۔ اگر وہ اس سے سنبھل جائے تو خیر، ورنہ اس پر تباہی بغتۃً (اچانک) آجایا کرتی ہے۔"

حقوق اور ذمہ داریاں

انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور حیوان مجبور ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا، بڑی لذّت بخش اور کیف انگیز خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اسے کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا۔ لیکن فطرت کی طرف سے یہ متاعِ گراں بہا مفت نہیں مل گئی۔ اس نے اس کی بڑی قیمت وصول کی ہے اور وہ قیمت ہے ذمّہ داری (RESPONSIBILITY)۔ جتنی زیادہ اختیار کی وسعتیں اتنی بڑی ذمہ داری۔ لیکن جہاں انسانی اختیارات کے استعمال سے بے پناہ لذّت حاصل کرتا ہے وہاں ذمہ داری کا بوجھ اس پر بہت گراں گزرتا ہے چنانچہ اس کی ہمیشہ کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ سچے یا جھوٹے حقیقی یا مصنوعی اختیارات کے استعمال سے لذت اندوز اور کیف آشنا تو ہوتا رہے لیکن کسی نہ کسی طرح ذمہ داریوں کے بوجھ سے بچ جائے۔ نوعِ انسان کی تاریخ کا بیشتر حصہ اسکی اسی خود فریب کوشش کی داستان ہے۔ اس میں وہ طبقہ بھی شامل ہے جس نے ذہنی یا جسمانی قوت اور برتری حاصل کر کے ایسے نظریاتِ حیات اور نظامہائے تمدّن و معاشرت وضع کئے جن سے ان کی ہوسِ اقتدار کی تو تسکین ہوتی رہے لیکن ان کی چیرہ دستیوں کی ذمّہ داری ان پر عاید نہ ہو۔ دوسری طرف کمزور اور زیرِ دست طبقہ بھی، ان تمام چیرہ دستیوں کو محض اپنی کمزوری اور کم ہمّتی کی بنا پر برداشت کرتا اور اس طرح ان انسانیت سوز نظریات و نظامہائے تمدّن و سیاست کی کامیابی کا ذریعہ بنتا رہا لیکن اپنے اوپر اس کی ذمہ داری لینے سے کتراتا رہا۔ آپ قرآن کریم کی تعلیمات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کس طرح ان تمام معتقدات اور نظریات کی ایک ایک کر کے تردید کرتا ہے جن کی رُو سے انسان اپنی ذمہ داری سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ پاکستان کو زندگی حاصل کرنیکا یہ آخری موقعہ ملا ہے۔ اب یہ حکومت اور عوام کی اپنی کوشش پر موقوف ہے کہ یہ اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر

زندگی کی نعمتوں سے دوبارہ ہمکنار ہو جائیں یا اپنی تساہل انگیزیوں اور ہوس رانیوں سے اس نایاب موقع کو ضائع کرکے ان قوموں میں جا ملیں جن کے متعلق قضا و قدر کا حتمی فیصلہ ہے کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتیں۔

بدرگاہِ ربّ العزت

اور سب سے آخر میں ایک گزارش اس بارگاہ میں ہے جو دنیا کی ہر گزارش کا آخری ملجا ہے۔ بچپن میں ایک قصہ پڑھا کرتے تھے کہ کسی "صاحبِ دل" نے ایک بے نماز کو ایک عرصہ کی تلقین کے بعد، نماز پڑھنے پر آمادہ کر لیا۔ اُسے نماز سکھائی۔ غسل کرایا۔ کپڑے بدلوائے۔ جائے نماز بچھائی۔ قبلہ رُو کھڑا کیا۔ اور اللہ اکبر کہلوا کر سینے پر ہاتھ بندھا دیئے ــــ اس کے بعد خود ہاتھ اٹھا کر کہا۔

اے مقلب القلوب! اتنا کچھ تو میں نے کر دیا ہے۔ میں یہی کچھ کر سکتا تھا۔ اس کے بعد تُو اسے خود سنبھال لے۔

طلوعِ اسلام بھی اس بارگاہِ صمدیت میں، جھکی ہوئی نگاہوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے عرض کرتا ہے کہ جو کچھ ہم ناتوانوں کے بس میں تھا ہم نے کر دیا۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جو کچھ ہم نے کیا ہے اگر یہ تیری میزان میں پورا اترتا ہے تو اس کے بعد اس امر کا انتظام تو اپنے دوسرے بندوں کے ہاتھوں کرا دے کہ اس کوشش ناتمام کے ذریعے، راہ گم کردہ انسانوں کا یہ کارواں اس راہ پر چل نکلے جو تیری بتائی ہوئی راہ ہے اور جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی واحد اور اقوم راہ ہے۔ باقی رہا ہماری ان حقیر کوششوں کا صلہ ــــ سو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

جب تیرے حضور تیرا آخری رسولؐ، انسانوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ ــــ یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۲۵/۳۰ (یا اللہ! یہ ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو چھوڑ رکھا تھا) تو ہم اس گروہ کے اندر نہ کھڑے ہوں۔ بس اس سے زیادہ اور کوئی آرزو نہیں"

ثنویت کو ختم کر دو

قرآن کریم کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی دنیا کے متعلق خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین ہیں اسی طرح خود انسانی دنیا کے متعلق بھی غیر متبدل قوانین ہیں۔ جس طرح طبیعی دنیا کے قوانین کی پابندی سے تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی سے تخریب ہوتی ہے اسی طرح انسانی دنیا سے متعلق قوانین کے مطابق نظامِ معاشرہ متشکل کرنے سے انسانیت آگے بڑھتی ہے اور ان کی خلاف ورزی سے اس کا ارتقاء رک جاتا ہے جس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے قوانینِ فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کے اس امتزاج کا نام الدین ہے۔ ان میں ثنویت (DUALITY) پیدا کر دی جائے تو اس کا جو نتیجہ برآمد ہو گا اسے قرآن کے الفاظ میں سنیئے۔ سورہ بقرہ میں ہے :-

کیا تم الکتاب (ضابطۂ قوانین) کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور اس کے دوسرے حصہ سے انکار کرنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو! تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ وہ دنیاوی زندگی

ہیں ذلیل ہوگا اور اُخروی زندگی میں شدید بدترین سزا ہی میں مبتلا ۔ (۲/۸۵)

سیکولر تصورِ حیات میں قوانینِ فطرت پر ایمان لایا جاتا ہے اور مستقل اقدار سے کفر برتا جاتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے ۔

مذہب میں قوانینِ فطرت سے کفر برتا جاتا ہے اور (بزعم خویش) وحیٔ خداوندی پر ایمان لایا جاتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے ۔ اور

الدین میں قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار خداوندی دونوں پر ایمان لایا جاتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اس کے لئے تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال پیچھے پلٹنا ہوگا ۔

پاکستان میں زکوٰۃ کا نظام

طلوعِ اسلام کی جون ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا :-

سوال : پاکستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر کارنیلیس نے اگلے دنوں تجویز کیا ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ پانچ سالہ بانڈز کی شکل میں جمع کر کے خیرات کے کاموں میں صرف کیا جائے ۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب کارنیلیس صاحب اسلامی امور کے متعلق اکثر تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں لیکن اس سلسلہ میں ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کارنیلیس صاحب عیسائی ہیں اور چونکہ عیسائیت ایک مذہب ہے اس لئے وہ اسلام کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں اسے ایک مذہب سمجھ کر ہی کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن اسلام مذہب نہیں دین ہے ۔ مذہب میں (بائیبل کے الفاظ میں) قیصر کا قیصر کو دیا جاتا ہے اور خدا کا حصہ خدا کو ۔ لیکن دین میں اس قسم کی ثنویت (DUALISM) کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی ۔ اسلام میں زکوٰۃ انفرادی خیرات کا نام نہیں ۔ اسلامی حکومت کی پوری کی پوری آمدنی کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جس سے وہ افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کا فریضہ ادا کرتی ہے (یہی زکوٰۃ کے لفظی معنی بھی ہیں) اس لئے اس کی وصولیابی یا خرچہ کے لئے اسلامی حکومت کو کوئی جداگانہ انتظام نہیں کرنا ہوتا ۔ کارنیلیس صاحب کو اس باب میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اس کے ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور حکومت کی طرف سے عائد کردہ ٹیکسوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ۔ ان لوگوں کے ذہن میں بھی خدا اور قیصر کی ثنویت سمائی ہوئی ہے ۔ دین کا تصور ان کے سامنے بھی نہیں ۔

اسلامی نظام کا واضح مفہوم متعین کیا جائے

ماہنامہ طلوعِ اسلام جون ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں اس امر کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا :-

موجودہ مسلمانوں کی پہلی مشکل تو یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو سمجھ سوچ کر ، بہ طیبِ خاطر بطور نظامِ زندگی اختیار نہیں کیا ۔

اور ان کی دوسری دشواری یہ ہے کہ جس اسلام کی طرف یہ اپنی نسبت کرتے ہیں اس کا کوئی متعین مفہوم ان کے سامنے نہیں ۔

اور تیسری دشواری یہ ہے (اور یہ سب سے اہم اور بنیادی دشواری ہے) کہ بہیئتِ مجموعی اسلام کا جو تصور ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اسے اُس اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں جسے خدا نے اپنے رسولؐ کی وساطت سے عطا فرمایا تھا ۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ نظامِ سرمایہ داری کو مسلمانوں کے تمام مذہبی فرقے عین اسلام قرار دیتے ہیں اور اسلام میں فرقوں کے وجود کو کوئی بھی شرک تسلیم نہیں کرتا ! حالانکہ یہ دونوں چیزیں اسلام

کی یکسر نقیض ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ

اسلامی نظام کا واضح مفہوم متعین کیا جائے ـــــ ایک متعین مفہوم۔ یہ کام مذہبی پیشوائیت کے بس کا نہیں ہماری مذہبی پیشوائیت، فرقہ بندی کا شکار ہے اور فرقہ بندی میں (قرآن کے الفاظ میں) ہوتا یہ ہے کہ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۲) ۔ ہر فرقہ اپنے مسلک کو حق سمجھتا ہے اور اپنے عقائد میں ایسا مست ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کسی نظریہ کو حق سمجھنا تو درکنار، وہ اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنا بھی کفر و الحاد کے مرادف سمجھتا ہے۔ فرقہ بندی قائم ہی اس قسم کی متشدد عصبیت سے رہ سکتی ہے۔ جو حضرات، ہزار برس سے یہ نہ طے کر سکے کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے یا نیچی سے۔ کیا وہ پورے کے پورے اسلامی نظام کا ایک متفق علیہ مفہوم متعین کر سکیں گے؟ ان سے ایسی توقع رکھنا خود فریبی ہے۔

یہ کام مملکت کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام میں نہ دین و دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور نہ ہی انسانی زندگی کو مختلف خانوں (COMPARTMENTS) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امت کی پوری پوری زندگی کے متعلق ضوابط مقرر کرے۔ ظاہر ہے کہ مملکت کی طرف سے متعین کردہ ضابطہ قوانین ساری قوم کے لئے ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں دین و دنیا کی تفریق تو ایک طرف، شخصی اور پبلک لاز کی تفریق بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا یعنی اسلامی نظام کا مفہوم متعین کر کے اسے ملک میں عملاً نافذ کرنا۔

مذہبی پیشوائیت تو ایسا کر نہیں سکتی تھی اس لئے اس نے نہ اب تک ایسا کیا، نہ ہی ایسا وہ کبھی ..... کر سکے گی لیکن ہمارے ہاں کی مملکت نے، ایسا کر سکنے کے باوجود، ایسا نہ کیا۔

لیکن کسی نے ایسا کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کے بغیر نہ مملکت اسلامی بن سکتی ہے، نہ موجودہ مسلمان، مسلمان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اسلامی قانون کا مستقبل

پاکستان کے حصول کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کسی حکومت کے اسلامی قرار پانے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اس اعتبار سے تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلا اور بنیادی سوال یہ سامنے آیا کہ اسلام میں قانون سازی کا اصول کیا ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں یہ اصول پیش کیا کہ دین کی بنیاد کتاب اللہ (قرآن کریم) پر ہے جو کچھ اس میں دیا گیا ہے وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہے اور اس کے حرفاً حرفاً منجانب اللہ ہونے پر ہمارا ایمان ہے۔ قرآن میں تھوڑے سے احکام ہیں اور دیگر امور کے متعلق صرف اصول دیئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ مقصد اس سے یہ کہ ان اصولوں کی جزئیات اسلامی مملکت (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے گی یہ جزئیات وقت کے تقاضوں کے مطابق قابل تغیر و تبدل ہوں گی لیکن قرآن کے اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہیں گے اس طرح

(علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے، اسلامی قوانین، اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔

اس کے برعکس قدامت پرست طبقہ کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے جس قدر قوانین اسلاف سے چلے آرہے ہیں وہ سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ ان کا یہی مؤقف ہے جس کی مخالفت کی وجہ سے وہ طلوعِ اسلام کو ملحد، بے دین اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر گردن زدنی ٹھہراتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کا یہی مؤقف ہے جس کی وجہ سے پاکستان میں قانون سازی کا معاملہ، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر مصروفِ گردش ہے اور اس بیس[1] سال میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔

لیکن مذہبات کیسے ہی مقدس کیوں نہ ہوں، اگر ان کی بنیاد آسمانی حقائق پر نہ ہو، تو وہ وقت کے دھارے کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل نہیں ہو سکتے۔ زمانہ کی بے پناہ رَو انہیں راستے سے ہٹا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے قدامت پسند طبقہ کی اس قدر کورانہ مخالفت کے باوجود پاکستان میں یہ رجحانات عام ہو رہے ہیں کہ جو قوانین ہمارے یہاں متوارث چلے آرہے ہیں ان میں اسلامی مملکت ردّ و بدل کرنے کی مجاز ہے۔

معاشی بدحالی

ہم اربابِ حکومت کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بایں امید کہ وہ ان پر نہایت سنجیدگی سے، ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور صرف غور ہی نہ کریں، بلکہ ان میں سے جنہیں وہ مفید سمجھیں ان پر بلا تاخیر عمل بھی کریں۔

ملک کی معاشی بدحالی موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا فطری نتیجہ ہے اور اس کا کما حقہٗ ازالہ نظام کی تبدیلی سے ہو سکتا ہے لیکن ہمیں اس کا احساس و اعتراف ہے کہ کوئی معاشی نظام شباشب بدلا نہیں جا سکتا۔ اسے بتدریج ہی بدلا جا سکتا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ جس نظام کو آخر الامر قائم کرنا مقصود ہو، اس کے خدوخال کی متعین طور پر وضاحت کر کے پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ اس طریقِ کار کے مطابق اس وقت سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ممتاز شہریوں کی ایک مختصر سی کمیٹی کو ساتھ لے کر، اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ایک متوسط گھرانے کی بنیادی ضروریاتِ زندگی۔ کھانا۔ کپڑا۔ مکان، علاج معالجہ وغیرہ ـــ کم از کم کتنے روپے ماہوار میں پوری ہو سکتی ہیں۔ یہ وہ رقم ہوگی جس کا مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔ ملازمین کی کم از کم تنخواہ یہ ہوگی۔ مزدوروں کی کم از کم اجرت یہ ہوگی۔ جو لوگ کام کرنے سے طبعی طور پر معذور ہوں، یا جنہیں کام میسّر نہ آتا ہو ان کا کم از کم الاؤنس اس قدر ہوگا۔ (علاج معالجہ میں صرف روزمرہ کی عام شکایات شامل ہوں گی۔ شدید قسم کے امراض، حادثات اور نہ چکنے وغیرہ کا انتظام حکومت کی طرف سے الگ ہوگا) یاد رکھئے، جسطرح ایک بزرگ خاندان (مثلاً باپ) کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام افرادِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرے، اسی طرح (قرآنی تصورِ مملکت کے مطابق) ملک کی حکومت کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرے۔ اگر اس کی آمدنی کم ہے تو وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کی صورت پیدا کرے اور جس قدر آمدنی ہے اس کی تقسیم اسطرح

---

[1] اب چھتیس سال کہئے (۱۹۸۳ء)

کرے کہ افراد خانہ میں سے کسی کی ضرورت رُکی نہ رہے۔ ملک کی خوشحالی کا ثبوت ہی یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ اسی سے حقیقی امن اور اطمینان پیدا ہو سکتا ہے۔

ہوشربا گرانی

اس وقت ملک کی حالت یہ ہے کہ آج ایک چیز کی قیمت پانچ روپے ہے، کل اسی دکاندار سے وہی چیز مانگیئے تو وہ اس کی قیمت سات روپے بتائے گا۔ اس سے اس کی وجہ دریافت کیجئے تو وہ جواب میں کہے گا صاحب! آج بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ (چڑھ گیا ہے اس طرح کہہ دیتے ہیں، جیسے کوئی بندر خود بخود درخت پر چڑھ جائے۔) عام شہری بیچارے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ بھاؤ چڑھتا کیسے ہے اور اسے چڑھاتا کون ہے۔ اسے بہرحال اسی چڑھتے ہوئے بھاؤ کے مطابق چیز خرید نی پڑتی ہے اور جو بھاؤ ایک مرتبہ چڑھ جاتا ہے، وہ پھر نیچے کبھی نہیں اُترتا۔ اُوپر ہی چڑھتا چلا جاتا ہے۔

حکومت کو چاہیئے کہ وہ ہر چیز کی قیمت مقرر کرے اور ان قیمتوں کی تختی متعلقہ دکان پر لٹکوائے اگر وہ اس کا کنٹرول نہیں کر سکتی تو اسے ہر جگہ اپنی دکانیں کھولنی چاہئیں جہاں سے ہر ضرورت کی چیز مقررہ نرخ پر مل سکے اپنی دکانیں کھولنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہاں سے خالص چیزیں مل سکیں گی اس وقت تک ملک میں ملاوٹ کا کوئی علاج نہیں ہو سکا بلکہ یہ مرض دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

رشوت کی لعنت

رشوت اس معاشی نظام کا منطقی نتیجہ ہے جس میں کسی فرد کو مستقبل کی معاشی ضمانت (SECURITY) حاصل نہیں ہوتی، اس لیئے وہ ہر جائز و ناجائز طریق سے دولت سمیٹنے کی فکر اور جائیدادیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے اس کا کلی خاتمہ تو معاشی نظام کی تبدیلی ہی سے ہوگا لیکن اس کی فوری اصلاح کے لئے ہم نے کچھ عرصہ پہلے ایک تجویز پیش کی تھی اور وہ یہ کہ حکومت اپنے ملازمین کو، ان کی اور ان کے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی کی پوری پوری ضمانت دیدے اور اس کے بعد ان کے لئے ذاتی املاک (پرائیویٹ پراپرٹی) قانوناً ممنوع قرار دیدے۔

شکایت کی شنوائی

اس وقت حکومت کے دفاتر میں جسقدر دھاندلی مچ رہی ہے، کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اس کے خلاف شکایت کر کے دادرسی حاصل کی جا سکے۔ ویسے تو ہر نیا حاکم، اپنے تقرر کے بعد، عام اعلان کرتا ہے کہ اس نے اپنے دروازے پر "عدلِ جہانگیری" کی زنجیر لٹکوا دی ہے لیکن یہ زنجیر لٹکی کی لٹکی رہ جاتی ہے بلکہ بعض اوقات فریادیوں کے لئے الٹی زنجیرِ پا بن جاتی ہے ضروری ہے کہ ہر دفتر کے ساتھ ایک ایسا اعلیٰ پایہ کا با اختیار افسر تعینات ہو جس تک فریادی رسائی حاصل کر سکے اور وہ اس کی شکایت کی تحقیق کرے، انصاف کا تقاضا پورا کرے۔

اس قسم کے افسر، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ہونے چاہئیں۔ اگر کسی کو معلوم (بلکہ یقین) ہو کہ ایک مقام ایسا ہے جہاں میری شنوائی ہو سکتی ہے تو اس کے دل میں ایجی ٹیشن کا جذبہ ابھرتا ہی نہیں۔ اشتعال تو مایوسی کے ردِّ عمل کا نام ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ شیطان (سرکشی) اور ابلیس (مایوسی) ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ بلّی اس وقت حملہ کرتی ہے جب وہ کمرے کے سب دروازے بند پاتی ہے۔ اس وقت افرادِ معاشرہ جو ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انہیں اپنی شکایات کی چارہ جوئی کے لئے کوئی دروازہ کھلا نہیں ملتا۔

عدل

موجودہ نظام کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک مظلوم کو انصاف حاصل کرنے کے لئے اخراجات کا زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ کسی مقدمہ میں جو فریق بھی برسرِ حق ثابت ہو اس پر حصولِ عدل اور دادرسی کے لئے کسی قسم کا بار نہیں پڑنا چاہیئے۔ نیز مقدمات کے فیصلہ میں آجکل جس قدر ناقابلِ برداشت تاخیر ہوتی ہے اس سے نہ صرف انصاف کا گلا گھٹ جاتا ہے بلکہ ملک کی آبادی کے ایک معتدبہ حصہ کا وقت اور توانائی بُری طرح ضائع ہو جاتی ہے۔ اس سے ملک کی مجموعی دولت کی پیدائش پر جس قدر مضر اثر پڑتا ہے وہ بالکل واضح اور عیاں ہے۔ اس مقصد کے لئے کمیشن تو بہت بٹھائے گئے لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ اس کی ایک بڑی وجہ موجودہ قوانین کا پیچیدہ اور مبہم ہونا ہے۔

حصولِ عدل کے معاملہ میں ہمارے ہاں کا طبقۂ نسواں بڑا ہی مجبور اور مظلوم واقع ہوا ہے۔ عائلی قوانین نے ان بیچاریوں کو کچھ تھوڑی سی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں لیکن نظم و نسق کی بے ضابطگیوں سے وہ بھی معطل ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں نہایت ضروری ہے کہ فیملی کورٹس کی جج خواتین ہوں، ہمارے ہاں کی عورت کسی عورت کے سامنے تو اپنی بات بیان کر سکتی ہے، مرد کے سامنے نہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جو عورت اپنے جابر و ظالم خاوند سے گلو خلاصی کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اس کی حفاظت کا اپنا انتظام نہ ہو، حکومت اس کی حفاظت کا انتظام کرے۔ خاوند کے خلاف قانونی شکایت کے بعد وہ اس کے درپے آزار ہو جاتا ہے اور مختلف حربوں سے اسے اس قدر تنگ کرتا ہے کہ وہ بیچاری مجبور ہو کر، اپنی شکایت واپس لے لیتی ہے۔ اور جب وہ اس کے بعد پھر اسی چنگل میں پھنس جاتی ہے تو وہ انتقام جوئی کے جذبہ کے ماتحت اس پر پہلے سے بھی زیادہ مظالم توڑتا ہے ور اس سے مخلصی حاصل کرنے کی اس مظلوم کے پاس کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ ضرورت ہے کہ حکومت کا نظامِ عدل و عافیت اس طرف خصوصی توجہ دے۔ دنیا میں کوئی معاشرہ مہذب تو کجا شریف نہیں کہلا سکتا اگر اس میں عورت محفوظ نہیں۔

حکام کا رویہ

انگریزوں کو اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ یہاں کے عوام کو محکوم اور اپنے آپ کو حاکم سمجھیں۔ انہوں نے افسروں کے لئے اصطلاح تو وہی رائج کی جو ان کے اپنے ملک میں مروج تھی یعنی (PUBLIC SERVANTS) — عوام کے خادم — لیکن عملاً وہ رہے حاکم کے حاکم۔ ہم نے نظامِ حکومت انہی سے ورثہ میں پایا ہے اور اگرچہ اب صورت یہ ہے کہ ملک میں کسی کو محکوم سمجھنا پاکستان کی آزادی کے دعویٰ کے منافی ہے لیکن عملاً ہمارے عمّالِ حکومت، اپنے آپ کو انگریزوں جیسا حاکم اور افرادِ معاشرہ کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی "داروغہ صفائی" بھی کسی راہرو سے بات کرتا ہے تو ایسی رعونت سے گویا اسے اختیاراتِ شاہی حاصل ہیں۔ عمّالِ حکومت کے اس ذلت آمیز رویہ نے ہی ملک میں انتظامیہ کے خلاف جذباتِ نفرت عام کر رکھے ہیں۔ ضرورت ہے کہ علامہ اقبالؒ کی یہ نصیحت ایوانِ حکومت کے ہر در و دیوار پر کندہ اور عمّالِ حکومت میں سے ہر ایک کے لوحِ قلب پر نقش کر دی جائے کہ۔۔

بملازمانِ سلطان خبرے دہم ز رازے
کہ جہان توان گرفتن بہ نوائے دلگدازے

ملازمتوں میں جداگانہ نیابت

تشکیلِ پاکستان کے وقت، انگریزوں کی عملداری کے مطابق یہ ملک مختلف صوبوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر چند کہ یہ تقسیم انتظامی امور کے لئے تھی لیکن (انگریزوں کی حکمت فرعونی کے تقاضا کے تحت) صوبوں کی یہی تفریق، خود مسلمانوں میں نسلی تفریق کا موجب بن چکی تھی۔ ہم نے یہاں پہنچکر انتظامی امور کے پیش نظر اس صوبائی تقسیم کو حتی حالہ رہنے دیا، لیکن اس نسلی تفریق کو مٹانے کے لئے جو صوبوں کی لکیروں سے پختہ نقوش کی شکل اختیار کر چکی تھی، کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔ بلکہ قدم اٹھایا بھی تو ایسا جس سے باہمی تفریق و تقسیم کی یہ گرہیں اور مضبوط ہو جائیں۔ مثلاً ۱۹۳۱-۳۰ء کا ذکر ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمان چونکہ ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں اس لئے انہیں سرکاری ملازمتوں میں ان کی آبادی کے لحاظ سے جداگانہ نیابت ملنی چاہیئے۔ ہندوؤں کی طرف سے تو اس مطالبہ کی مخالفت ہونی تھی، سو ہوئی لیکن خود مسلمانوں میں سے بھی بعض نے یہ کہکر اس کی مخالفت کی کہ "روٹیوں، بوٹیوں" پر اس قسم کا جھگڑا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ یہی خواہانِ ملت کے زعماء کی طرف سے اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا کہ بظاہر یہ مطالبہ "روٹیوں بوٹیوں" کی تقسیم کا دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے اثرات بڑے دوررس، اور اس کے نتائج بڑے عمیق ہونگے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں ملازمتوں کی جداگانہ نیابت کا اصول طے پا جائے گا تو اس سے یہ خود بخود دو قوموں میں بٹ جائیں گے اور ان میں ایسی خلیج حائل ہو جائے گی جو کبھی پاٹی نہیں جا سکے گی۔ چنانچہ جب یہ اصول طے پا گیا اور اس پر عملدرآمد شروع ہو گیا تو مندرجہ بالا اندازہ ایک حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک ایک اسامی کی تقسیم پر جب جھگڑا اٹھتا تھا تو ہندو اور مسلمان دو متخالف اور متحارب فریقوں کی شکل میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے عملاً دو جداگانہ قوموں میں منقسم ہو جانے میں جس قدر کردار اس ایک فیصلے نے ادا کیا تھا، دیگر عناصر اس سے کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے ان میں مستقل خلیج حائل کر دی تھی اور ہمارے سیاسی رہنما اپنی اس سکیم پر بہت نازاں تھے۔ اور بات تھی بھی ایسی جس پر بجا طور پر فخر کیا جائے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہم نے پہلا یہ قدم یہ اٹھایا کہ مختلف صوبوں کے لئے (یعنی مختلف نسلوں کے لئے) ملازمتوں میں جداگانہ نیابت کا فیصلہ کر دیا۔ ہم نے اسی زمانے میں اس ناعاقبت اندیشانہ، تباہ کن فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو اصولِ نیابت ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس قدر مستقل تفریق و اختلاف کا باعث بنا تھا وہ پاکستان میں مختلف صوبوں میں بسنے والے افراد میں اسی قسم کی مستقل تفریق و اختلاف کا باعث بن جائیگا اور اس سے ایسی بین الصوبجاتی عصبیت پیدا ہو گی جسے آپ قیامت تک دور نہیں کر سکیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پاکستانی مسلمان کبھی ایک قوم کے رشتے میں منسلک نہیں ہو سکینگے۔ ہماری بات کسی نے نہ سنی اور ملک میں باہمی کشت و افتراق کے شجرۃ الزقوم[1] کا بیج بو دیا گیا یہی بیج اس بیس سال کے عرصہ میں ایک ایسے تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا جس کی ہر شاخ، دوسری شاخ سے الگ اور ہر پتہ دوسرے پتے سے جدا ہے

---

[1] اور اب یہ شجرۃ الزقوم کی شاخیں ہماری قوم کی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہو چکا ہے۔ (۱۹۸۳ء)

نتیجہ اس کا یہ کہ مسلمانانِ پاکستان کے دل سے، ایک قوم کے افراد ہونے کا تصور تک مٹ چکا ہے اب یہاں بنگالی بستے ہیں، بلوچی بستے ہیں، پنجابی بستے ہیں۔ سرحدی بستے ہیں۔ پاکستانی کہیں نہیں بستے۔

صوبائی تفریق

ماہنامہ طلوع اسلام کی اگست ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا ہے:-

وحدتِ ملت کے ضمن میں ایک نقطہ ایسا ہے جس کی طرف اربابِ حکومت کی توجہ خاص طور پر دلانا ضروری ہے۔ ضروری ہی نہیں بلکہ اشد ضروری۔ اس حقیقت کو ہم میں سے ہر شخص دن میں دس بار دہراتا ہے کہ اسلام نسب، نسل، قوم، وطن، رنگ، زبان کے تمام انسان سوز امتیازات کو مٹا کر معیارِ تکریم فقط جوہرِ ذاتی تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور قرآن کی نصِ صریح۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں دو رائے ہو نہیں سکتیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے اس حقیقت کو اس طرح تسلیم کرنے والی اور بار بار دہرانے والی حکومت پاکستان نے عملاً کیا کیا ہے؟ انہوں نے مرکزی ملازمتوں میں صوبہ وار نیابت کا اصول نافذ کر رکھا ہے۔ ذرا سمجھ لیجئے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ مثلاً پاکستان کی اعلیٰ ترین سروس کا امتحان ہوتا ہے جس میں ایک سو امیدوار کامیاب ہوتے ہیں۔ ان امیدواروں کی ان کے حاصل کردہ نمبروں کے لحاظ سے فہرست مرتب کر لی جاتی ہے۔ اب عدل و مساوات اور جوہرِ ذاتی کے معیار کا تقاضا یہ ہے کہ آسامیوں کے مطابق نمبروار امیدوار منتخب کر لئے جائیں۔ لیکن کیا یہ نہیں جاتا۔ کیا یہ جاتا ہے کہ ان آسامیوں کو صوبہ واری نیابت کے لحاظ سے تقسیم کر لیا جاتا ہے اور اس کے مطابق امیدواروں کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ مثلاً ایک سندھی لڑکا دسویں نمبر پر ہے اور ایک بنگالی پچاسویں نمبر پر۔ تو اس سندھی کو چھوڑ دیا جائے گا اور بنگالی کو منتخب کر لیا جائے گا۔ غور فرمائیے کہ اس بنیادی بے اصولی کے نتائج کس درجہ دور رس اور تباہ کن ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ مملکتِ پاکستان بہترین دماغوں سے محروم کر دی جاتی ہے اور ان کی جگہ کمتر قابلیت کے افراد حکومت کی مشینری کے کل پرزے بنا لئے جاتے ہیں۔ سوچئے کہ جب دس بیس سال تک معیارِ انتخاب ایسا ہی رہا تو حکومت کی مشینری کس قسم کے عناصر پر مشتمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد دوسری طرف دیکھئے جس اعلیٰ پوزیشن کے امیدوار کو نظر انداز کر کے پست درجے کے امیدوار کو منتخب کر لیا گیا ہے اس امیدوار کے دل میں حکومت کا کیا وقار باقی رہ جائے گا؟ اس کا سینہ عمر بھر کے لئے آتشدانِ شکایت بنا رہے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی سوچئے کہ اس صوبہ واری نیابت سے صوبائی عصبیت کی لعنت کس درجہ عمیق اور شدید ہوتی جا رہی ہے اور چند سال کے بعد اس کی کیفیت کیا ہو جائے گی۔

یاد رکھئے! پورے کا پورا پاکستان ایک مملکت ہے۔ پاکستان کے تمام مسلمان ایک ملت ہیں۔ ان میں انتخاب کا معیار صرف جوہرِ ذاتی ہونا چاہیئے۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائیگا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا نسب

ابلیس و آدم

(تازہ ایڈیشن شائع ہوگیا)

پرویز صاحب نے جب سلسلۂ معارف القرآن شروع کیا تو من دیز داں (اللہ) کے بعد دوسری جلد ابلیس و آدم کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں۔ اس کے بعد یہ کتاب کمیاب تھی۔ اب اس کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے

کتاب کے مشمولات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

۱۔ انسان کی تخلیق۔
۲۔ نظریۂ ارتقا۔
۳۔ قصۂ آدم۔
۴۔ ابلیس۔
۵۔ شیطان۔
۶۔ جنّات۔
۷۔ ملائکہ۔
۸۔ روح (نفس)
۹۔ وحی (کشف و الہام)۔
۱۰۔ نبوّت اور رسالت۔
۱۱۔ کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟

کتاب دستیاب بہترین سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ بڑی تقطیع ضخامت پونے چار سو صفحات۔ جلد مضبوط خوبصورت مزیّن اور مطلّا قیمت فی جلد -/۷۵ روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

۱۔ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار۔ لاہور

۲۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔بی گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور

وقت کی پکار

ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ عوام کو مذہب کے متعلق ذاتی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ ان کی مسجد کے مولوی صاحب جو کچھ انہیں بتا دیتے ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ باقی رہا پڑھا لکھا طبقہ سو ہماری مذہبی پیشوائیت نے جس قسم کا مذہب ان کے سامنے پیش کیا ہے اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ بیکار سی چیز ہے، اس لئے انہیں مذہبی امور سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ یہ صورت حالات کسی دوسرے ملک میں ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ وہاں مذہب ایک پرائیویٹ شے ہوتا ہے جسے ملک کے معاملات سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ وہاں، عوام جس انداز سے جی چاہے مذہبی تسکین حاصل کریں، اور خواص، بے شک اس سے غیر متعلق (DISINTERESTED) ہو جائیں۔ اس سے ملک کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن پاکستان میں حالات بالکل مختلف ہیں۔ اس ملک کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں نہ تو مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ قرار دے کر مسجدوں اور خانقاہوں میں محدود کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی اس سے لاتعلق رہا جا سکتا۔ یہ تو اس مملکت کی رگِ جان ہے۔

اب آپ سوچئے کہ مملکت کی زندگی میں جس شے کی اہمیت اس قدر ہو لیکن اس کے متعلق نہ عوام کو کچھ معلوم ہو نہ خواص کو، اس مملکت کا حال کیا ہوگا؟ حال یہ ہوگا کہ جس شخص کا جی چاہے گا، مذہب کے نام پر اسے گھسیٹتا پھرے گا۔ یہاں یہی کچھ چھتیس سال سے ہو رہا ہے اور اب یہ معاملہ (CLIMAX) تک پہنچ رہا ہے۔

تحریک پاکستان کے دوران جب کہا گیا تھا کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہوگی، تو ذہنوں میں یہی تھا کہ اسلام ایک ایسی وحدت (UNITY) ہے جس میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس وحدت پر مملکت کی بنیاد نہایت آسانی سے استوار ہو جائے گی۔ لیکن یہاں آ کر جب اسلام کی عملی تعبیر کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ہمارا مروّجہ اسلام، ایک وحدت نہیں، مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ کا اسلام الگ الگ ہے۔ اس سے بڑی تشویش لاحق ہوئی کہ یہ مملکت قائم کس طرح ہو سکے گی؟ مذہبی پیشوائیت اتنی عظیم مملکت پر نگاہ لگائے بیٹھی تھی۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ مملکت ان کے ہاتھوں سے چھن جائے گی۔ وہ فوراً آگے بڑھے اور کہا کہ ہمارے فرقہ وارانہ اختلافات کو اچھالنا بڑا گمراہ کن پراپیگنڈہ ہے۔ ہمارے یہ اختلافات فرعی ہیں۔ ان کے باوجود ہم میں ایک قدرِ مشترک ایسی ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے اور وہ ہے،

کتاب وسنّت

مملکت کی بنیاد اسی پر استوار ہوگی۔ لیکن جب اس دعویٰ کا تجزیہ کیا گیا تو نظر آیا کہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جو قوم کو دیا جا رہا ہے۔ یہ "کتاب وسنّت" ہی کا اختلاف ہے جس پر ہمارے الگ الگ فرقے قائم ہیں۔ اس اصطلاح میں کتاب کا نام تو محض تبرکاً لیا جاتا ہے۔ اصل اہمیت سنّت کو حاصل ہے۔ آیئے ہم مختصر الفاظ میں دیکھیں کہ سنّت کے متعلق ان کے اختلافات کس قدر شدید ہیں۔

۱۔ اہلِ حدیث حضرات کا عقیدہ ہے کہ حدیث اور سنّت میں کوئی فرق نہیں۔ صحیح احادیث کے مجموعہ کا نام ہی سنّت ہے۔ لیکن مودودی (مرحوم) کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے:۔

سنّت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنّت ہے۔ لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنّت اس طریقِ عمل کو کہتے جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کیے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنّت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۳۱۱۔۳۱۰)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

سنّت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنّت نہیں ہیں، ان کو خواہ مخواہ سنّت قرار دے دینا من جملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔۔۔۔۔ یہ دین میں تحریف ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی مرتب ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

(ایضاً صفحہ ۳۱۴: ۳۰۸: ۳۰۰)

سنّت کے متعلق مودودی (مرحوم) کے اس عقیدہ کے خلاف، جماعتِ اہلِ حدیث نے سخت احتجاج کیا اور جمعیتِ اہلِ حدیث کے صدر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے اپنے کتابچہ ——— جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث ——— میں لکھا:۔

میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں بلکہ تمام ائمہ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔۔۔۔۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنّتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

(صفحہ ۱۰ ؛ ۶۳)

یہ ہے سنّت کے متعلق ان دو اہم گروہوں کے اختلاف کی شدت کا عالم!

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک گروہ کے نزدیک حدیث اور سنّت ایک ہی چیز ہے اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ سنّت کو احادیث سے مستنبط کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے ان دونوں میں حدیث، قدرِ مشترک قرار پا جاتی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ احادیث کے متعلق ان کے اختلافات کا کیا عالم ہے۔ جماعتِ اہلِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا..... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ صفحہ ۴۸)

اس معیار کے مطابق۔ ان حضرات کے نزدیک:۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمت متفق ہے..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۵)

یعنی جماعت اہلِ حدیث کے عقیدہ کی رو سے، بخاری اور مسلم کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے جس سے وہ شخص اُمتِ محمدیہ کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔

اور مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

یہ اس لئے کہ

قول رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں..... ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کو اسناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی (صلعم) کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۷۰)

آپ نے غور فرمایا کہ سنّت کے متعلق ان دونوں گروہوں میں کس قدر بنیادی اختلاف ہے۔ ایسا اختلاف جس کی بنا پر اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک مودودی (مرحوم) اور ان کے ہم عقیدہ دیگر حضرات کافر، اور ملتِ اسلامیہ سے خارج قرار پاتے ہیں۔ اور مودودی (مرحوم) کے نزدیک، اہلِ حدیث حضرات دین میں تحریف کرنے کے جرمِ عظیم کے مرتکب!

یہ اختلاف مودودی (مرحوم) اور جماعتِ اہلِ حدیث ہی میں نہیں۔ اہلِ حدیث اور حنفی حضرات میں بھی ہے۔ (جن کے سرخیل مفتی محمود (مرحوم) تھے) حنفی علماء میں مولانا ظفر احمد عثمانی (مرحوم) کا مقام بڑا بلند تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اہلِ حدیث

کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے۔ لیکن مولانا عثمانی مرحوم کا ارشاد ہے:۔

> حنفیہ کے نزدیک بھی کتاب البخاری و مسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہیں۔ اور مسلم پر بخاری کو ترجیح ہے۔ مگر اس سے وہ مواضع مستثنےٰ ہیں جن پر دارقطنی وغیرہ محدثین نے تنقید کی ہے کہ ان کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ محلِ اختلاف ہیں۔ دارقطنی وغیرہ نے تقریباً دوسو احادیث پر تنقید کی ہے جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔ ان مواضع کے سوا بقیہ کی صحت پر اتفاق ہے۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۴۳)

یعنی اہلِ حدیث کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی کفر ہے، اور حنفی حضرات ان میں سے کم از کم دوسو احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ اس بناء پر اہلحدیث حضرات حنفیوں پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ ان فرقوں میں بُعد اور منافرت کس قدر ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ مولانا مفتی محمد حسن (مرحوم) مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (مرحوم) کے خلیفہ اور مدرسہ جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے بانی تھے۔ ان کے متعلق مولانا جمیل احمد صاحب نے حسبِ ذیل واقعہ، اخبار خدام الدین (لاہور) کی ۲۸ جون ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں بیان کیا تھا:۔

> (مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے) حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی (نوراللہ) سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ تم نے احادیثِ مبارکہ، اہلِ حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں اور میں حنفی ہوں۔ جوڑ پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں، پھر درخواستِ بیعت کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے تین سال دیوبند میں تعلیم میں صرف کئے۔ اس کے بعد حضرت نے بیعت فرمایا۔

یہ ہے اہلِ حدیث اور حنفی حضرات کے اختلافات کا عالم۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ خیال فرمالیں کہ حنفی حضرات مودودی (مرحوم) کے ساتھ متفق ہیں۔ مودودی (مرحوم) کے متعلق، مولانا ظفر احمد عثمانی (مرحوم) کا ارشاد تھا:۔

> یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ گمراہ اور مبتدع ہے۔ جاہل جہل ہے۔ پاگل ہے۔
>
> (مقامِ حدیث ـــــ جلد دوم۔ ایڈیشن اوّل صفحہ ۱۱۸۔۱۱۹)

یہ تصریحات سنیوں کے متعلق ہیں۔ شیعہ حضرات، سنیوں کے کسی مجموعۂ احادیث کو بھی صحیح نہیں مانتے۔ انکے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔

ان مختصر سی تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ سنت کے معاملہ میں ہمارے مختلف فرقوں میں کس قدر شدید اختلافات ہیں۔ سنت کا یہی اختلاف ہے جس کی بناء پر:۔

۱۔ مختلف فرقوں کی نمازیں الگ الگ ہیں۔ اور ہر فرقہ اپنی نماز کو سنت پر مبنی قرار دیتا ہے۔ نمازوں کے اوقات تک الگ ہیں۔ روزانہ نمازوں کے علاوہ، جمعہ کے الگ الگ وقت۔ جمعہ کی نمازوں کی جماعتیں الگ الگ اور ان کے اوقات الگ الگ۔ جنازہ کی نمازیں بھی الگ الگ۔ ان سب کا مدار سنت پر بتایا جاتا ہے۔

۲۔ ان کی اذانیں بھی الگ الگ ہیں۔ اور ہر ایک اپنی اذان کی سند سنت سے لاتا ہے۔ وضو تک کی جزئیات الگ الگ ہیں۔

۳۔ اسی رمضان میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ حنفی بیس تراویح پڑھتے ہیں۔ اہلِ حدیث صرف آٹھ۔ عیدین کی نماز میں حنفی چھ زائد تکبیریں کہتے ہیں، اہلِ حدیث بارہ تکبیریں۔

۴۔ روزوں کے مسائل الگ الگ۔ زکوٰۃ کی جزئیات الگ الگ۔

۵۔ نکاح و طلاق کے احکام الگ الگ۔ وراثت کے احکام الگ الگ۔

غرضیکہ زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس میں احکامِ سنت میں اختلاف نہ ہو۔

ان اختلافات سے یہ حضرات یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ ان کا تعلق عقائد، عبادات اور پرسنل لاز سے ہے۔ امورِ مملکت سے ان کا تعلق نہیں۔ اس لئے اسلامی مملکت میں، ہر فرقہ کو ان امور کی آزادی حاصل ہو گی مملکت ان میں دخل انداز نہیں ہوگی۔ مملکت کا دائرہ صرف پبلک لاز تک محدود ہو گا۔ اور یہ لاز، کتاب وسنت کی رُو سے مرتب ہوں گے جن کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں ہو گا۔ تیس سال تک ان حضرات نے قوم کو اس مغالطہ میں مبتلا رکھا کہ پبلک لاز کے معاملہ میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہو گا۔ اس طرح ہم مملکت میں اسلامی نظام قائم کر دیں گے۔ اس دعویٰ کے سب سے بڑے داعی مودودی (مرحوم) تھے۔ ہم ان سے بار بار کہتے رہے کہ یہ معاملہ بڑا نازک اور اہم ہے۔ اس پر مملکت پاکستان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ خدا کے لئے وضاحت سے بتائیے کہ ایسا کس طرح ممکن ہو گا؟ تیس سال تک وہ اس سوال کے جواب سے گریز کرتے رہتے۔ لیکن بالآخر انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ

> کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (اخبار ایشیاء۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

اس طرح کتاب وسنت کی بنیادوں پر، اسلامی قوانین مرتب کرنے کے دعویٰ کی قلعی کھل گئی! پوچھا گیا کہ پھر پبلک لاز کیسے مرتب ہوں گے۔ کہا کہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لئے یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے گی۔ اس پر اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔ انہوں نے کہا کہ جس فقہ کو ہم اسلامی نہیں مانتے، اگر اسے مملکت کے قوانین کی حیثیت سے ہم پر ٹھونسا گیا تو ہم انہیں کس طرح اسلامی تسلیم کر کے ان کی اطاعت کریں گے؟ جب مفتی محمود (مرحوم) نے سرحد میں وزارت قائم کی تھی تو بریلوی حضرات نے احتجاج کیا تھا کہ

> مفتی صاحب دیوبندیت کو مسلط کرنے کے لئے اپنے اقتدار کو استعمال کر رہے ہیں۔ (تنظیم اہلِ حدیث ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

اس کے بعد ان حضرات نے "کتاب وسنت" کے نعرہ کو چھوڑ کر "نظامِ مصطفٰے" کا نعرہ اختیار کیا۔ لیکن ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ کیا "نظامِ مصطفٰے" "کتاب وسنت" سے الگ ہو گا؟ اگر یہ کتاب وسنت ہی پر مبنی ہو گا، تو اس میں ایسا کونسا لطیفہ ہو گا کہ قوانین کس طرح مرتب ہو سکیں گے جو اہلِ حدیث، شیعہ اور حنفیوں کے نزدیک، متفقہ طور پر اسلامی قرار پا جائیں۔ نہ کسی نے ان سے پوچھا۔ نہ انہوں نے ازخود اس کی وضاحت ضروری سمجھی۔

مذہبی پیشوائیت کا تو فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ ہر بات مبہم رہے۔ ہم عوام سے تو کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ ایسے اہم معاملات کے عواقب کا سمجھ لینا ان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ملک کے تعلیم یافتہ دانشور طبقہ کی خدمت میں عرض کریں گے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے معمولی سمجھ کر آپ اس سے اس طرح لاتعلق ہو کر بیٹھے رہیں۔ اس مسئلہ کا بنیادی تعلق اس مملکت کی سالمیت بلکہ بقا سے ہے۔ ہم نے، آپ نے، اور ہماری آنے والی نسلوں نے اس ملک میں رہنا ہے۔ ہماری عزت آبرو، عصمت و عفت۔ جان اور مال کی حفاظت، سب اسی کی حفاظت سے وابستہ ہے۔ اگر آپ اس وقت اس مسئلہ سے لاتعلق ہو کر بیٹھے رہے تو یاد رکھئے! یہاں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ اگر یہ مسئلہ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہا تو ایک ایک انچ زمین پر ان میں سر پھٹول ہوگی، اسی طرح جس طرح آج مسجدوں کی تولیت پر ان میں سر پھٹول ہوتی ہے۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں ملک کا کیا حشر ہوگا؟

تحریکِ پاکستان کے دوران مابہ النزاع مسئلہ ہی ایک تھا۔ ہمارا دعویٰ (اور مطالبہ) تھا کہ ہم اس لئے الگ مملکت چاہتے ہیں کہ اس میں اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ ہندو کہتا تھا (اور نیشنلسٹ علماء اس کی عملاً تائید کرتے تھے) کہ اب مذہب کی بنیادوں پر حکومتیں قائم کرنے کا زمانہ لد گیا۔ یہ تم لوگوں کا خیالِ خام ہے۔ جذبات سے الگ ہو کر حقائق کا سامنا کرو اور اس ضد کو چھوڑ دو۔ کانگریس کے صفِ اوّل کے لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے کہا تھا کہ

> اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔
>
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۵ ۹/۴۸)

خود مسٹر گاندھی بار بار کہتے تھے کہ

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔
>
> (ہریجن۔ ۹ ۱۲/۴۶)

جب ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان پاس ہوئی تو (مسٹر) گاندھی پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ مسلمانو! تم جناحؒ کے فریب میں مت آؤ۔ یہ اسکیم کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ مذہب کی بنیاد پر کوئی مملکت قائم نہیں رہ سکتی۔

اور اب جب ہماری مذہبی پیشوائیت کی فرقہ پرستی اور اسلام کے غلط تصوّر کی وجہ سے ہم ناکام رہے تو ہندو پوری بلند آہنگی سے کہے گا۔۔۔ کیوں! ہم نہ کہتے تھے!۔۔۔ اس وقت یہاں کے مسلمانوں پر مایوسی چھا جائے گی۔ اس سے یا تو یہ ہوگا کہ

۱۔ یہاں کے کمیونسٹ اور سوشلسٹ ابھر کر آگے آجائیں گے اور کہیں گے کہ یہاں، سیدھے طور پر سیکولر نظام قائم کر دو اور یا

۲۔ بھارت لپک کر آگے بڑھے گا اور کہے گا کہ یا تو سرے سے تقسیم ملک کو ختم کر کے، انڈیا کے ساتھ پھر سے ایک ہو جاؤ۔ اور یا کانفیڈریشن قائم کر لو۔ ہمارے علماء (جو تحریک پاکستان کے دوران ہندوؤں کے ہم نوا تھے)، تقسیم کو ختم کرنے کی تائید کر دیں گے (کہ یہ شروع ہی سے تقسیم کے خلاف تھے) اور (کالعدم) جماعت اسلامی، کانفیڈریشن پر لبیک کہہ دے گی کہ مودودی (مرحوم) کی یہی اسکیم تھی۔ (مسٹر) گاندھی نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ

> اگر مذہب کو علیٰحدہ رہنے دیا جائے یعنی ایک نجی معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک مشترکہ عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی لائحۂ عمل بھی مشترک ہو۔
>
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۹ ستمبر ۴۷ء)

اور قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا تھا:۔

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان، اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ (۱۹ ستمبر ۴۸ء)

یہی وہ نیا دور ہے جس کے لئے بدقسمتی سے یہاں فضا ہموار ہو رہی ہے۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ پاکستان کی سکیم کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ سے بڑھ کر اسلامی نظام کی اہمیت سے واقف اور قائد اعظمؒ سے بڑھ کر اس کے لئے عملی کوشاں کون تھا؟ اس کے باوجود، یہ کیوں تھا کہ ...... کہ یہ دونوں پکار پکار کر کہتے رہے کہ پاکستان میں "تھیاکریسی" نہیں ہوگی۔ یہ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جس اسلام کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے وہ نہ حقیقی اسلام ہے اور نہ ہی قابلِ عمل۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

"اسلام" میں اس قدر فرقے ہوں، اور ہر فرقہ کا "اسلام" الگ الگ ہو، وہ اسلام ایک مملکت کا دستورِ اساسی بن کیسے سکتا ہے؟ بہر حال، اس "اسلام" کی رو سے مملکتِ پاکستان کا جو حشر ہوگا، اسے ہم نے کھلے الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب یہ قوم کے باہوش طبقہ کا کام ہے کہ وہ سوچے کہ اس ملک کو اس تباہی سے کیسے بچایا جا سکتا ہے جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم ان سے عرض کریں گے کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ حقیقی اسلام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ مملکت کی اساس و بنیاد بن سکے اور ایسا نظام قائم کر سکے جو نہ صرف مستحکم اور پائیدار ہو، بلکہ مثالی بھی ہو۔

اور وہ حقیقی اسلام قرآن مجید میں محفوظ ہے جسے نبی اکرمؐ امت کو دے کر گئے تھے۔

اِنسان نے کیا سوچا؟

ہمارے ہاں تعلیم کا نظام سیکولر ہے جس سے طالب علم کے ذہن میں لامحالہ یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اگر انسانی عقل کی رُو سے زندگی کے اہم بنیادی مسائل کا حل دریافت کیا جا سکتا ہے تو پھر وحی کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور نہایت سنجیدگی سے سوچنے کے قابل ہے۔ پرویز صاحب نے اس کے جواب کیلئے کیا یہ کہ افلاطون سے لے کر دورِ حاضرہ تک کے بڑے بڑے نامور مفکرین۔ مؤرخین۔ سائنسدانوں۔ ماہرینِ سیاست و معیشت اور علمائے تمدن و تہذیب کی شہرۂ آفاق تصانیف کے اقتباسات سے یہ واضح کر دیا کہ وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان مسائل کا حل تنہا عقل کی رُو سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب صورت یہ ہے تو پھر انسان کو ان مسائل کے حل کے لئے وحی کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ ان کی اس عدیم النظیر کتاب کا نام ہے۔

اِنسان نے کیا سوچا؟

یہ عام کتاب نہیں۔ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں سینکڑوں بلند ترین کتابوں کا ملخص یکجا کر دیا گیا ہے اور جس نے ہزارہا تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس خلش کو دُور کر دیا ہے جو وحی کی ضرورت کے متعلق انہیں وقفِ اضطراب رکھتی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا اور دُوسرا ۱۹۵۹ء میں۔ اس ایڈیشن کے محدود تعداد میں نسخے باقی ہیں۔ یہ اعلامیہ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ آپ کو ضرورت ہو تو آپ اس کا نسخہ جلدی منگا لیں۔ اس قسم کی کتابوں کے جدید ایڈیشن شائع ہونے میں وقت لگ جایا کرتا ہے۔ کتاب بڑے سائز کے قریب ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت روشن ٹائپ میں چھپی ہے۔

جلد مضبوط مزین اور مطلا قیمت فی جلد -/۷۵ روپے اور محصول ڈاک -/۶ روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور